معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/ روپے فی شمارہ ۱۲/ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ۔ حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۴ ماہ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۰۴ء عدد ۳

فہرست مضامین

ای میل : email: shibli_academy@rediffmail.com

شذرات

بی جے پی کی سابقہ مرکزی حکومت نے ملک میں نفرت کی جو آگ بھڑکائی تھی وہ ابھی تک شعلہ افگن ہے، اس نے سرکاری مشنریوں اور انتظامی شعبوں پر اپنے افکار و نظریات کی ایسی گہری چھاپ ڈال دی ہے کہ مرکز میں ترقی پسند اتحاد حکومت بننے کے بعد بھی یہ عناصر اپنی روش بدلنے اور آر ایس ایس کی مضبوط گرفت سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور وہ حکومت کے سیکلر اور انقلابی اقدامات کی راہ میں روڑا بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کا احساس بائیں باز و محاذ کو نہایت شدت سے ہے اور اس نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ سرکاری مشنری کو ایسے عناصر سے پاک کیا جائے جو سنگھ پریوار سے ذہنی و فکری وابستگی رکھتے ہیں اور اب فروغ انسانی وسایل کے مرکزی وزیر مسٹر ارجن سنگھ نے بھی بڑی بے باکی سے کہا ہے کہ ہماری اولین ذمہ داری ہے کہ ہم آر ایس ایس سے تعلق رکھنے والے فسطائی عناصر کو پہچانیں، ان کی نشان دہی کریں، ہمیں سرکاری انتظامیہ کو ایسے عناصر سے پاک صاف کرنا چاہیے۔

ان بیانات سے بی جے پی اور سنگھ پریوار چراغ پا ہے، فروغ انسانی وسایل کی مرکزی وزارت نے ریاستی وزرائے تعلیم کی ایک میٹنگ کی اور ماہرین تعلیم کے مشورے سے بعض درسی کتابوں اور ان کے زہریلے مواد کو نصاب سے نکال دینے کا ارادہ کیا تو بی جے پی کی ریاستی حکومتوں کے وزرائے تعلیم واک آؤٹ کر گئے اور درسی کتابوں کے کوڑا کرکٹ کی صفائی میں رخنے ڈالے، آندھرا پردیش کے کانگریسی وزیر اعلا نے مسلمانوں کی پس ماندگی اور غربت کی بنا پر انہیں ۵ فیصد ریزرویشن دینے کا اعلان کیا تو پورے ملک میں تحریک چلانے کی دھمکی دی گئی، داغی وزیروں کے نہ نکالے جانے اور ویر ساورکر کی قوم دشمنی اور گاندھی جی کے قتل میں ان کے ملوث ہونے کی نشان دہی کر دینے پر بی جے پی نے ایوان بالا و زیریں میں ترقی پسند اتحاد کی حکومت کی ناک میں دم کر رکھا ہے جب کہ نفرت اور فسادات کی آگ بھڑکا کر سارے ملک کو جہنم بنا دینے والے اس کے اپنے داغی اور ملزم وزرا چھ برس تک وزارت کے مزے اڑا چکے ہیں اور مودی پر ہزاروں بے گناہوں

کے خون ناحق کا الزام بھی ہے اور عدالت عالیہ کا سخت ریمارک بھی مگر وہ گجرات کے وزیر اعلا بنے ہوئے ہیں۔

بی جے پی اور سنگھ پریوار کی مخالفت کے ان بہت اوچھے اور سطحی طریقوں اور گوناگوں رکاوٹوں کے باوجود یو پی اے حکومت کا قدم آگے بڑھ رہا ہے اور کانگریس جس بھول بھلیوں میں پھنس گئی تھی اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی ہے، ۱۵/ اگست کو وزیر اعظم کی منفرد اور انوکھی تقریر اسی کی غماز ہے اور ۲۱/ اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس سے اس کی بعض چیزوں سے قطع نظر ہوا کے بدلے ہوئے رخ، فرقہ پرستی سے لڑنے کے عزم اور کانگریس کے اپنے اصلی موقف کی طرف واپسی کا اشارہ ملتا ہے، ۲/ اور ۳/ جولائی کو مرکزی وزیر مسٹر ارجن سنگھ کی صدارت میں اقلیتوں کی تعلیمی ترقی اور سماجی فلاح و بہبود کے مسایل پر گفت و شنید اور مشورے کے لیے جو کانفرنس ہوئی تھی اور جس کا افتتاح وزیر اعظم نے کیا تھا اس میں بھی اقلیتوں کو تعلیمی و معاشی سطح پر ملک کے دوسرے طبقوں کے ہم پلہ بنانے، ان کو قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں مناسب نمایندگی دلانے کے لیے آمادگی ظاہر کی گئی، مسٹر ارجن سنگھ نے اس موقع پر سب سے اہم بات یہ فرمائی کہ "ملک میں سماج کے مختلف طبقوں میں ابھی تک باہمی اتحاد اور رواداری کی فضا پیدا نہیں ہو سکی ہے اس لیے اقلیتوں اور کم زور طبقوں کے مسایل حل کرنے میں سخت دشواریاں حایل ہیں، گزشتہ حکومت کے تحت وزارتوں نے جانب داری اور تعصبات سے کام لے کر مسئلے کو اور زیادہ مشکل بنا دیا"۔

لیکن باہمی اتحاد اور رواداری کی فضا مفقود ہو جانے کے لیے صرف بی جے پی کو قصوروار قرار دینا اور کانگریس کو بالکل بری الذمہ سمجھنا غلط ہے، کانگریس کو اپنے گزشتہ طویل دور حکومت میں اقلیتوں اور ان کے مسایل پر توجہ دینے کا کبھی خیال نہیں آیا جن کے لیے آج بی جے پی کو مطعون کیا جا رہا ہے، گجرات ہی جیسے ایک سے بڑھ کر ایک بھیانک فساد ہوا، ارجن سنگھ کو جبل پور کا فساد یاد ہوگا مگر کانگریس نے مظلوموں کی دادرسی کی اور نہ مجرموں کو سزا دی، ۴۹ء سے بابری مسجد کے انہدام تک کے سارے مراحل کس کے دور حکومت میں پیش آئے، ارجن سنگھ خود مدھیہ پردیش کے وزیر اعلا رہے ہیں، ان کی عمر کے یو۔ پی، بہار، پنجاب اور آندھرا پردیش وغیرہ کے جو وزرائے اعلا ابھی تک

باقی رہ گئے ہیں ان سے خلوت میں پوچھیں کہ ان ریاستوں میں قصہ اردو کو کس کے لہو نے رنگین کیا ہے اور آج جس بی جے پی کے خلاف محاذ بنانے کی باتیں ہو رہی ہیں اس کو پروان چڑھانے اور اتنا طاقت ور بنانے میں کس کے دست ناز کی کارفرمائیاں ہیں، ماضی کی اس تلخ کہانی کے آئینے میں کانگریس کا چہرہ صاف نمایاں ہے لیکن اگر اب اس کو تنبہ ہوا ہے اور آثار ونشان بتا رہے ہیں کہ وہ سیکولرزم کے موقف کی طرف لوٹ رہی ہے تو اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا جانا چاہیے، جو دشواریاں حائل ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی بشرطیکہ کانگریس اپنے اصل موقف پر جمی رہے اور ادھر ادھر نہ بھٹکے، مسز سونیا گاندھی اور من موہن سنگھ کی شریفانہ قیادت اور ارجن سنگھ، آر کے آنند اور منی شنکر آیئر جیسے بیدار مغز سیکولر لیڈروں کی رہبری سے یہ توقع بے جا نہیں۔

کانفرنس میں مختلف طبقہ خیال کے مسلمان زعما شریک تھے اور انہوں نے اپنے اپنے انداز میں بحث وگفتگو میں حصہ لیا، اخباری رپورٹوں کے مطابق علی گڈھ مسلم یونی ورسٹی کے وایس چانسلر کی تجربے پر مبنی یہ مفید تجویز احتجاج کا باعث بن گئی کہ ”تمام تعلیمی اداروں میں سرکاری تعاون ملتا ہو یا نہ ہو ۷۵ فیصد سیٹیں مسلم طلبہ کے لیے محفوظ ہوں اور ان میں درج فہرست ذاتوں کے ریزرویشن کو شامل نہ کیا جائے کیوں کہ تعلیمی پس ماندگی کی صورت حال مسلمانوں میں زیادہ پیچیدہ ہے“ مگر ہم کو اس تجویز سے مکمل اتفاق ہے، حکومت اگر واقعی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنا چاہتی ہے تو کم از کم اقلیتی تعلیمی اداروں میں اسے ضرور ایسا ہی کرنا چاہیے، بعض شعبوں میں صرف مسلم طلبہ ہی کا داخلہ اور مسلم استاذ کا تقرر کیا جانا عملاً ممکن ہے، اس میں درج فہرست ذاتوں کے ریزرویشن کی وجہ سے سیٹیں خالی رہ جاتی ہیں اور اساتذہ کا تقرر برسوں کے لیے رکے رہنے سے طلبہ کا نقصان ہوتا ہے، حکومت کو چاہیے کہ مدارس عربیہ کے مسایل پر غور وخوض کے لیے ان کے فضلا اور سربراہوں سے تبادلۂ خیال کر کے ان کی مشکلات حل کرے اور جدید اقلیتی تعلیمی اداروں کی دشواریوں کو سمجھنے کے لیے ان کے سربراہوں اور ماہر تعلیم کے مشوروں سے فایدہ اٹھائے کیوں کہ ؎

شرح مجموعۂ گل مرغ سحری داند وبس   کہ نہ ہر کو ورقے خواند معانی دانست

☆☆☆

مقالات

احادیث عاشوراء: ایک درایتی تجزیہ

از:- پروفیسر ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی ☆

یوم عاشوراء کے روزے سے متعلق رسول اکرمؐ کی مبارک احادیث مختلف کتب میں ملتی ہیں، محدثین کرام اور محققین علمانے ان کی تشریح وتعبیر کرتے ہوئے ان پر مفصل بحث کی ہے اور ان کی مختلف جہات کو بہ خوبی اجاگر بھی کیا ہے، تاہم اب بھی بہت کچھ الجھنیں اور اشکالات باقی ہیں، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ عاشوراء سے متعلق احادیث نبویؐ متعدد کتب میں بکھری ہوئی ہیں اور ان میں بہ ظاہر باہم اختلاف بھی ہے، ایک اہم سبب یہ ہے کہ تمام صحیح احادیث کا ان کے صحیح تاریخی اور واقعاتی پس منظر میں مطالعہ نہیں کیا گیا۔

یہ مطالعہ اور درایتی تجزیہ بہت آسان تھا کیوں کہ محدثین کرام نے بالخصوص شیخین نے اپنی اپنی صحیح میں ان کے خاص ابواب باندھے ہیں اور صیام عاشوراء سے متعلق تمام احادیث نبویؐ ایک جگہ جمع کر دی ہیں، ان کے ابواب ہی رہنما خطوط فراہم کرتے ہیں: امام بخاری کی صحیح میں کتاب الصیام کا ۶۹ ”باب صیام یوم عاشوراء“ اور امام مسلم کی صحیح میں ”باب صوم یوم عاشوراء“ میں متعدد احادیث بیان کی گئی ہیں اور ان کے متون ہی ان کے تاریخی مطالعہ اور درایتی تجزیہ کی راہ ہموار کرتے ہیں کیوں کہ ان میں زمانی توقیت، وجوب فرضیت، ترک وتبادلے، حکمی حیثیت کے علاوہ متعدد دوسرے شواہد وعلایم ملتے ہیں۔

ابہام والجھن کا سب سے بڑا بنیادی سبب ہمارے اکثر اہل علم کا اسلامی احکام کے ارتقا کے متعلق یہ نظریہ ورویہ ہے کہ اسلام کے بنیادی احکام کا نزول و وجوب حیات نبویؐ کے مدنی دور مبارک

ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی، ریسرچ سیل ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڈھ

میں ہوا تھا، مکی دور میں محض چند احکام آئے اور بیش تر اخلاقی تعلیمات و عقاید کا درس دیا گیا، پھر دونوں ادوار اسلام کا مطالعہ الگ الگ کیا گیا اور ان میں ارتقائی لہر اور سلسلے کا سراغ گم لگایا گیا، اس بنا پر ملت حنیفیہ سے ان کے تعلق و ربط کا خیال نظروں سے اوجھل ہو گیا حالاں کہ اسلام کے بنیادی، اصلی اور آفاقی دین ہونے کا دعوی سب کو ہے مگر اس کے شعور و ادراک میں پیوست کا معاملہ دگر گوں ہے۔

رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت اور اس کی زمانی توقیت نے ہمارے ادراک کو بہت متاثر کیا اور ہم نے یہ تصور کر لیا کہ اسلام میں رمضان شریف کے روزے فرض کیے گئے جن کی فرضیت مدنی دور نبویؐ میں ہوئی تھی، لہذا یہ واقعہ ہی ذہن و علم و ادراک سے محو ہو گیا کہ مکی دور میں بھی۔ یعنی رمضان کے روزوں سے پہلے بھی۔ روزے کی فرضیت ہوئی تھی اور چوں کہ مدینہ کے یہودی بھی عاشوراء کے روزے رکھتے تھے، اس لیے بعض علما اور احادیث کے طلبہ و اساتذہ کے ذہن میں بھی یہ خیال جم گیا کہ عاشوراء کا روزہ محض ایک یہودی روایت تھی۔

رسول اکرمؐ نے ہجرت مدینہ کے بعد محض حضرت موسیٰؑ کے یوم نجات کے شکرانے کے طور پر اسے قبول کر لیا، صوم عاشوراء کے آغاز و سبب، یہودی روایت کی حمایت و مخالفت اور اسلام میں سنت محمدی کی فطرت کو گڈ مڈ کر دیا گیا، بعض احادیث کو الگ اکائی اور مستقل حکم سمجھ کر یہ غلط نتیجہ نکال لیا گیا کہ رسول اکرمؐ نے محض اس لیے صوم عاشوراء رکھا کہ حضرت موسیٰؑ بہ طور نبی و رسول آپؐ کے بڑے بھائی تھے، لہذا آپؐ نے ان کی اتباع و پیروی میں روزہ رکھا، اسی سے متعلق ایک اور حدیث نبویؐ میں آیا ہے کہ آپؐ نے یہود کی مخالفت میں ایک دن قبل یا ایک دن بعد روزہ رکھنے کا حکم دیا، ایک اور حدیث میں یہ ارادۂ نبوی ظاہر کیا گیا کہ بہ شرط زندگی آپؐ بھی اس حکم آخر پر عمل فرمائیں گے مگر زندگی نے وفا نہ کی، ان تمام احادیث صحیحہ کو ان کے زمانی تناظر میں رکھا گیا اور نہ ان کا صحیح مطالعہ کیا گیا اور اس نے ابہام و الجھن کو اور گہرا کر دیا۔

ماہرین فن واقف ہیں کہ آیات قرآنی ہوں یا احادیث نبویؐ، ان کا مجموعی مطالعہ ضروری ہے، کسی ایک ہی آیت اور ایک ہی حدیث سے بالعموم پورا حکم نہیں نکلتا سوائے اس کے کہ اس باب و موضوع پر وہی ایک ماخذ واحد ہو، دوسرے محدثین کرام نے اور ان سے زیادہ فقہائے اسلام نے

تمام متعلقہ احادیث و آیات کے مجموعی تجزیہ اور مربوط مطالعہ کو درایت و استنباط کا مدار بنایا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان اکابر اہل علم اور صاحبان بصیرت کے ہاں کسی قسم کا شائبہ ابہام نہیں پایا جاتا، راقم کے اس مطالعہ حدیث کا اصل مقصد دوسروں سے زیادہ اپنے ہی ذہن کو صاف کرنا اور صحیح درایتی تجزیہ کرنا اور خود کو سمجھانا ہے، خیال ہے کہ تجزیاتی مطالعہ کو تاریخی توقیت اور پس منظر میں پیش کرنے سے زیادہ اچھے اور عمدہ نتائج حاصل ہوں گے، اس لیے یوم عاشوراء سے متعلق تمام احادیث نبویؐ کو ان کے موضوع و مضمون کے اعتبار سے چند "طبقات" میں تقسیم کر کے الگ الگ زیر بحث لایا جا رہا ہے۔

عہد جاہلی میں روزۂ عاشوراء

۱- امام مسلم نے حضرت عائشہؓ کی سند سے بیان فرمایا ہے کہ یوم عاشوراء کا روزہ جاہلیت میں رکھا جاتا تھا، اسلام آنے کے بعد جس کا جی چاہتا اس کا روزہ رکھتا اور جس کا دل ہوتا اسے ترک کر دیتا، اس کی سند و متن حسب ذیل ہے:

حدثنی عمرو الناقد حدثنا سفیان عن الزهری عن عروة عن عایشه رضی الله عنها: ان یوم عاشوراء کان یصام فی الجاهلیة فلما جاء الاسلام من شاء صامه، ومن شاء ترکه۔ (نووی، المنهاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج، دار الخیر دمشق ۱۹۹۸ء، ۲/۱۹۹)

اس حدیث میں جو حدیث: ۱۱۴ کی متابع ہے کئی چیزوں کا ذکر نہیں: ۱- کون روزہ عاشوراء رکھتا تھا؟ اسلام کے آنے کے بعد اس کے "نفل" اختیاری بننے کا زمانہ کیا ہے؟ رسول اکرمؐ کا طرز عمل اور فرمان عالی کیا تھا؟ اور مسلم مکی امت کا تعامل کیا تھا؟

۲- صحیحین کی ایک دوسری حدیث حضرت عائشہؓ میں اس کی صراحت ملتی ہے کہ جاہلیت میں قریش عاشوراء کا روزہ رکھا کرتے تھے اور رسول اکرمؐ بھی جاہلی عہد میں اس کا روزہ رکھا کرتے تھے لیکن اس کے بعد کے حصہ حدیث میں شیخین کی روایات مختلف ہیں، امام بخاری کی حدیث: ۲۰۰۲ میں ہے کہ رسول اکرمؐ جب مدینہ پہنچے تو اس کا روزہ رکھا اور اس کے روزوں کا حکم بھی دیا، پھر جب رمضان کی فرضیت ہو گئی تو آپؐ نے یوم عاشوراء کا روزہ چھوڑ دیا، اب جو چاہتا رکھتا اور جو نہ چاہتا وہ نہ رکھتا، امام مسلم کی حدیث: ۱۱۲۶ میں یہ تسلسل پایا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے

اس کے روزے رکھنے کا حکم دیا تا آں کہ رمضان فرض کر دیے گئے، تب رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ جو چاہے اس کا روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے، امام مسلم کی حدیث:۱۱۷ میں بھی یہی مضمون ہے اور امام بخاری کی حدیث:۲۰۰۱ میں بھی یہی حکم اور طرز عمل نبویؐ بیان کیا گیا ہے، ان تمام احادیث صحیحین کے متون ترتیب سے درج ذیل ہیں:

۲۰۰۲: حدثنا عبد اللہ بن مسلمۃ عن مالک عن ہشام بن عروۃ عن ابیہ عن عایشۃؓ قالت: کان یوم عاشوراء تصومہ قریش فی الجاہلیۃ وکان رسول اللہ ﷺ یصوم فی الجاہلیۃ، فلما قدم المدینۃ صامہ وامر بصیامہ، فلما فُرض رمضان ترک یوم عاشوراء، فمن شاء صامہ، ومن شاء ترکہ۔ (بخاری، فتح الباری ۳۱۰/۴، نیز موطا امام مالک مع تنویر الحوالک، سیوطی کی شرح، عیسی البابی الحلبی مصر، ۲۷۹/۱-۲۸۰: صیام یوم عاشوراء: حدیث حضرت عائشہؓ، ابوداؤد، سنن، حدیث:۲۴۳۹، باب فی صوم یوم عاشوراء، بیروت، ۱۴۲۱/۲۰۰۰، ۲۱۶، معمولی اختلاف کے ساتھ خلیل احمد سہارن پوری، بذل المجہود فی حل ابی داؤد، سہارن پور نمبر مورخہ، ۱۷۸/۳-۱۸۰)

۱۱۷: حدثنا ابو بکر بن ابی شیبۃ حدثنا عبد اللہ بن نمیر و حدثنا ابن نمیر و اللفظ لہ حدثنا ابی حدثنا عبید اللہ عن نافع اخبرنی عبد اللہ بن عمرؓ: ان اہل الجاہلیۃ کانوا یصومون یوم عاشوراء، و ان رسول اللہ ﷺ صامہ و المسلمون قبل ان یفترض رمضان، فلما افترض رمضان، قال رسول اللہ ﷺ: ان عاشوراء یوم من ایام اللہ، فمن شاء صامہ ومن شاء ترکہ۔ (مسلم، نووی، المنہاج ۲۰۰/۲ نیز سنن ابو داؤد: حدیث: ۲۴۴۰، ۲۱۶)۔

اس فصل میں شیخین کی اسی قدر احادیث پر اکتفا کی جاتی ہے کیوں کہ دوسری احادیثِ صحیحین بالخصوص جن میں حکم نبویؐ ملتا ہے، ان کا ذکر اگلی فصل میں کرنا زیادہ موزوں ہوگا، امام بخاری کی حدیث:۲۰۰۱ میں بھی اور اس کے بعد کی حدیث:۲۰۰۲ میں بھی حکم نبوی کی صراحت ملتی ہے، اس پر مزید بحث بھی اسی اگلی فصل میں آئے گی، امام مسلم نے البتہ عہد جاہلی میں عاشوراء کا

روزہ رکھنے سے متعلق متعدد احادیث نقل کی ہیں، ان کے متون کو نقل کرنے سے یہ حقیقت ثابت تر ہو جائے گی کہ عاشوراء کا روزہ رکھنا جاہلی دور کے لوگوں کا ایک معمول تھا۔

۱۱۸: و حدثنا قتیبۃ بن سعید حدثنا لیث ح وحدثنا ابن رمح اخبرنا اللیث عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما انہ ذکر عند رسول اللہ ﷺ یوم عاشوراء فقال رسول اللہ ﷺ: کان یوما یصومہ اہل الجاہلیۃ، فمن احب منکم ان یصومہ فلیصمہ، ومن کرہ فلیدعہ۔ (نووی ۲۰۰/۲ نیز ابن ماجہ، سنن، باب صیام یوم عاشوراء، حدیث: ۱۷۳۷، ۵۵۳)

۱۱۹: حدثنا ابو کریب حدثنا ابو اسامۃ عن الولید یعنی ابن کثیر حدثنی نافع ان عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حدثہ انہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول فی یوم عاشوراء: ان ہذا یوم کان یصومہ اہل الجاہلیۃ، فمن احب ان یصومہ فلیصمہ، ومن احب ان یترکہ فلیترکہ، وکان عبد اللہ رضی اللہ عنہ لا یصومہ الا ان یوافق صیامہ۔ (نووی ۲۰۰/۲)

۱۲۰: وحدثنی محمد بن احمد بن ابی خلف حدثنا روح حدثنا ابومالک عبید اللہ بن اخنس اخبرنی نافع عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قال: ذکر عند النبی ﷺ صوم یوم عاشوراء، فذکر مثل حدیث اللیث بن سعد سواءً۔ (نووی ۲۰۱/۲)

۱۲۱: وحدثنا احمد بن عثمان النوفلی حدثنا ابو عاصم حدثنا عمر بن محمد بن زید العسقلانی حدثنا سالم بن عبد اللہ حدثنی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قال: ذُکر عند رسول اللہ ﷺ یوم عاشوراء فقال: ذاک یوم کان یصومہ اہل الجاہلیۃ، فمن شاء صامہ ومن شاء ترکہ۔ (نووی ۲۰۱/۲)

بعض دوسری احادیث مسلم میں یہی مضمون دوسرے صحابہ کرام سے مروی ہے لیکن ان کا ذکر اگلی فصل میں کیا جائے گا۔

جاہلی عہد میں روزۂ عاشوراء کا سبب

صحیحین کی احادیث متفقہ ہوں یا مسلم شریف کی منفرد روایات، کسی میں یوم عاشوراء کے روزے رکھنے کا سبب نہیں بیان کیا گیا اور درایت کی بنیاد پر سوال اٹھتا ہے کہ جاہلی عہد کے لوگ یعنی قریش مکہ کیوں یہ روزہ رکھا کرتے تھے؟ امام بخاری کی حدیث ۲۰۰۲ کے مطابق رسول اکرمؐ جاہلیت میں روزہ عاشوراء رکھتے تھے لیکن اس کی وضاحت نہیں ہے کہ کیوں رکھتے تھے، اولین جملے سے یہ ربط سبب ہو سکتا ہے کہ قریش رکھا کرتے تھے تو آپ بھی رکھا کرتے تھے کہ ان کے ایک فرد جلیل تھے، بات گھوم پھر کر وہیں پہونچتی ہے کہ قریش اور حضرت محمد بن عبداللہ ہاشمی ﷺ کے دور جاہلی میں روزۂ عاشوراء رکھنے کا سبب کیا تھا؟۔

ان احادیث صحیحہ کے متون کے خلا کو پر کرنے اور سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں دوسری روایات و احادیث اور شارحین علما کی تشریحات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے کہ اس کے بغیر اس عقدہ کا حل اور جواب تلاش نہیں کیا جا سکتا، شارح مسلم امام نووی (ابوزکریا یحییٰ بن شرف: ۶۳۱-۶۷۶ھ) نے اس مسئلہ پر سرے سے بحث نہیں کی اگرچہ ان کی روزۂ عاشوراء سے دوسری بحث بہت مختصر ہونے کے باوجود گراں قدر اور شافی کافی بھی ہے، شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی (احمد بن علی بن حجر: ۷۷۳-۸۵۲ھ) نے البتہ مختصر بحث کی ہے، باب بخاری کی دوسری حدیث کی تشریح میں لکھا ہے کہ غالباً قریش نے عاشوراء کے روزے سابقہ شریعت سے لیے تھے اور اسی بنا پر وہ اس دن کی تعظیم میں خانہ کعبہ پر غلاف چڑھاتے تھے اور بعض دوسرے تعظیمی کام کرتے تھے، انہوں نے اپنے ایک غیر معروف یا کم معروف ماخذ "مجالس الباغندی الکبیر" کی تیسری مجلس کے حوالے سے اس کا سبب آغاز بھی بتایا ہے، حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد جلیل اور عظیم تابعی حضرت عکرمہ سے اس باب میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: جاہلیت میں قریش نے ایک گناہ کا ارتکاب کیا جس کی پھانس ان کے سینے میں جب زیادہ چبھنے لگی تو ان سے کہا گیا کہ عاشوراء کا روزہ رکھا کریں تو اس گناہ کا کفارہ ہو جائے گا، یہی الفاظ تھے یا یہی اس کے معانی تھے، اس کا عربی متن یہ ہے:

"...... واما صیام قریش لعاشوراء فلعلهم تلقوه من الشرع السالف ولهذا كانوا يعظمونه بكسوة الكعبة فيه وغير ذلك ثم رأيت في

المجلس الثالث من "مجالس الباغندی الكبير" عن عكرمة انه سئل عن ذلك فقال: اذنبت قريش ذنبا فى الجاهلية فعظم فى صدورهم فقيل لهم: "صوموا عاشوراء يكفر ذلك" هذا او معناه"۔
(فتح الباری ۴/۳۱۲)

حافظ ابن حجر عسقلانی کی وضاحت سے تشفی ہی نہیں، ابہام اور الجھن مزید بڑھتی ہے اور متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب انہوں نے نہیں دیا اور وہ بہت اہم سوالات ہیں: اول کس سابقہ شریعت سے قریش نے روزۂ عاشوراء کا اخذ کیا تھا؟ منطقی استدلال کی اور بات ہے مگر حافظ موصوف نے اس "شرع سالف" کی تصریح نہیں کی، اگرچہ بعد میں انہوں نے امام قرطبی کے حوالے سے شریعت ابراہیمی کے امکان کی بات کی ہے مگر اس مبہم روایت نے مسئلہ پیدا کیا ہے، حضرت عکرمہ کی طرف منسوب روایت باغندی تو اور بھی باعث خلجان ہے: قریش کا وہ گناہ کیا تھا؟ وہ کیوں ان کے دل کی پھانس بن گیا؟ کیا وہ شرک و بت پرستی سے بڑا تھا جس میں وہ مدت سے مبتلا تھے؟ اور کس نے صوم عاشوراء کو بہ طور کفارہ بتایا وغیرہ وغیرہ؟ قحط کے دور ہونے پر شکرانہ کا روزہ رکھا جیسا کہ بعض روایات میں ملتا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عاشوراء ہی کیوں اور وہ فرض کیسے بن گیا؟۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ بالعموم شارحین حدیث نے اور بالخصوص شارحین صحیحین، ابن حجر و نووی نے ملت حنیفیہ کا حوالہ نہیں دیا اور نہ ہی "شرع سالف" (گذشتہ شریعت) سے اس کو مراد ہی بتایا، کیا وہ مبنی بر احتیاط تعبیر و تشریح ہے؟ باب ایام الجاہلیہ وغیرہ کے حوالے سے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ غالباً انہوں نے یہ روزہ عاشوراء اہل کتاب سے لیا تھا، کم از کم شریعت موسوی اور دین عیسوی کا نام لیا جا سکتا تھا جیسا کہ بعد کے بعض علما و محققین نے کتب سماویہ کے حوالے سے کہا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ (م ۱۹۵۳ء) نے تورات کے حوالے سے لکھا ہے کہ یوں تو یہودی شریعت میں چالیس دنوں کا روزہ رکھنا مقرر و مستحب تھا کیوں کہ حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر چالیس دن روزے سے گذارے تھے تاہم عاشوراء کا روزہ رکھنا ان پر فرض تھا جو ان کی تقویم کے ساتویں مہینے (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی بنا پر اس کو عاشوراء (دسواں) کہتے ہیں۔ (سیرۃ النبی ﷺ

۲۱۲/۵-۲۱۳ بحوالہ خروج: ۳۴، ۳۸، سموایل: ۷، ۶، یرمیاہ ۳۶: ۶ وغیرہ) شریعت عیسوی بنیادی طور سے شریعت موسوی کی پابند تھی اس لیے اس میں بھی یہودی روزوں کی سنت جاری رہی تھی۔

مولانا شبیر احمد دیوبندی (۱۹۴۵ء) نے اپنی شرح مسلم فتح الملھم میں حافظ ابن حجر اور امام نووی کی شروح صحیحین سے ان کے اقوال وتعبیرات ہی نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کوئی نئی بات نہیں کہی ہے، (مطبوعہ باندہ پریس، جالندھر ۱۴۱/۳) و مابعد مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی بذل المجہود فی حل ابی داؤد ۷۸/۳ و مابعد میں صرف اقوال سلف پر تکیہ ہے، امام جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نے اپنی شرح موطا امام مالک بہ عنوان تنویر الحوالک میں یہی اس سے قبل کیا ہے اور اپنی شرح کا سارا دارومدار دونوں شارحین صحیحین پر قائم کیا ہے، (عیسی البابی الحلبی مصر ۲۷۹/۱-۲۸۰) سنن الترمذی کے شارحین میں امام ابن العربی مالکی (۴۳۵-۵۴۳) اور علامہ محمد یوسف حسینی بنوری (۱۳۹۷ھ) کا مکمل اعتماد انہیں دونوں شارحین صحیحین کو حاصل ہے اور ان کی تمام تر تشریحات ان کی تفسیرات کی مانند ہیں، (معارف السنن، کراچی ۴۳۱/۵-۴۴۰ نیز عارضۃ الاحوذی، داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۵ء، ۳/ ۲۸۴-۲۸۷)۔

ملتِ حنیفیہ میں روزۂ عاشوراء

دین اسلام کے آفاقی اور واحد دین ہونے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہودی شریعت میں عاشوراء کا روزہ کوئی نیا حکم نہ تھا، حضرت موسیٰؑ کی اتباع میں چالیس دنوں کے روزے مستحب و مسنون کے درجے میں تھے، فرض روزہ صرف عاشوراء کا قرار دیا گیا، حکم فرضیت کی علت فرعونِ مصر کے عذاب سے حضرت موسیٰؑ کی نجات نہیں ہوسکتی کہ وہ تاریخی طور سے بعد کا واقعہ ہے، شریعت موسوی میں اس کی فرضیت حضرت موسیٰؑ کی حیات بابرکات میں ہوئی تھی جسے نبی مکرم نے خود قرار دیا تھا، علما و عوام یہود نے اس کو بعد میں حضرت موسیٰؑ کے نجات کے واقعہ سے جوڑ کر شکرانہ کا روزہ بنا دیا جو نفل ہوسکتا ہے فرض نہیں۔

قریش مکہ اور اہل جاہلیت یہودی شریعت و قوانین کے تابع نہیں تھے اگرچہ وہ ان سے مرعوب ضرور تھے، تمام ساکنان عرب اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا پیرو، ملت حنیفیہ کا تابع اور دین اسماعیلی

پر عامل ہی نہیں بتاتے فخر بھی کرتے تھے، لہذا ان میں صوم عاشوراء کی روایت، سنت، فرضیت، یہودی شریعت اور یہودی طریقت سے آنے کا امکان کم تر رہ جاتا ہے، اس کا منطقی نتیجہ یہی نکالا جاسکتا ہے کہ عاشوراء کا روزہ دین حنفی کا بقیہ تھا جسے قریش مکہ بالخصوص رکھا کرتے تھے، روایات سیرت سے واضح ہوتا ہے کہ دوسرے ساکنانِ عرب اور قبایل ملک بھی روزہ کے تصور سے واقف اور اس پر عامل بھی تھے۔

اس استنباط و قیاس کی تائید مزید حدیثی روایات سے ہوتی ہے جو روزہ کے حکم کو تمام انبیا کی شریعت میں جاری و قایم قرار دیتی ہیں، حافظ ابن کثیر دمشقی نے سورہ بقرہ: ۱۸۳- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ کی تفسیر میں ایک حدیث یہ نقل کی ہے کہ امت محمدیہ سے قبل تمام گذشتہ امتوں پر ہر ماہ کے تین روزے فرض تھے، "وقد روی ان الصیام کان اولا کما کان علیه الامم قبلنا من کل شهر ثلاثة ایام" "عن معاذ وابن مسعود وابن عباس ...... الخ"، دوسری روایت کے مطابق رمضان کے روزے بھی گذشتہ اقوام و امم پر فرض کیے گئے تھے" صیام رمضان کتبه الله علی الامم قبلکم" (۲۱۳/۱) اول الذکر روایت میں یہ وضاحت بھی ہے کہ وہ حضرت نوحؑ کے زمانے سے مشروع تھے" لم یزل هذا مشروعا الی ان نسخ الله بصیام شهر رمضان"، اس بنا پر یہ قیاس و استنباط بالکل صحیح ہے کہ عاشوراء کا روزہ دین حنفی کا ایک فرض حکم رہا تھا۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ بہر حال حدیث عائشہؓ پر بحث کرتے ہوئے خاص کر روزۂ عاشوراء رکھنے کے حکم نبویؐ پر کلام کرتے ہوئے قریش کے جاہلی عہد میں روزۂ عاشوراء کے ماخذ کے بہ طور شرع ابراہیم کا امکان بتایا ہے، انہوں نے امام قرطبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ شاید قریش اپنے روزے میں حضرت ابراہیمؑ کی شریعت جیسی گذشتہ شریعت سے استناد کرتے تھے اور رسول اکرمؐ کا روزۂ عاشوراء رکھنے میں اس کا احتمال ہے کہ آپؐ قریش کی موافقت اسی بنا پر کرتے تھے، جس طرح حج کے معاملات میں کرتے تھے، اس کے بعد کی بحث کا حصہ دوسرے نکتہ سے متعلق ہے لہذا ابعد میں "...... قال القرطبی: لعل قریشا کانوا یستندون فی صومه الی شرع من مضی کابراهیم، و صوم رسول الله ﷺ یحتمل ان یکون بحکم الموافقة

لہم کما فی الحج ''(فتح الباری ۴/۳۱۴۴) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے اپنی
شرح موطا میں امام ابن رسلان کا واضح قول بھی نقل کیا جو امام قرطبی کے قول امکانی کے بعد آیا ہے
کہ قریش غالباً روزہ عاشوراء میں یہ سند رکھتے تھے کہ وہ شریعت ابراہیم و اسماعیل کا ایک حکم و فرض
تھا جس طرح وہ حج کے بہت سے احکام وغیرہ میں ان دونوں کی طرف نسبت کرتے تھے:'' قال
ابن رسلان: لعلہم یستندون فی صومہ الی انہ من شریعۃ ابراہیمؑ
واسماعیلؑ فانہم کانوا ینتسبون الیہما فی کثیر من احکام الحج وغیرہ''
(اوجز المسالک، طبع دوم، سہارن پور ۱۳۸۴ھ، ۳/۵۶)، موخر الذکر وضاحت میں شریعت حنفی
ہی کا نہیں شریعت ابراہیمی اسماعیلی کا واضح حوالہ ہے البتہ اس میں امکان کا شایبہ ہے، حضرت شاہ
ولی اللہ دہلویؒ کی عام تشریح شریعت قریش تسلیم کرنے کی صورت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ
دوسرے شرعی احکام کی طرح روزۂ عاشوراء ملت ابراہیمی اسماعیلی اور شریعت حنفی سے آیا تھا جو
اصل اسلام ہے اور بس کی اقتدا کا حکم الٰہی کتاب ربانی میں موجود ہے۔

مکی عہد نبوی ﷺ میں روزۂ عاشوراء

صحیحین کی احادیث نبویؐ سے بالخصوص اور دوسری کتب حدیث، موطا، ترمذی، ابوداؤد
وغیرہ سے بالعموم یہ واضح ہوتا ہے کہ قریش مکہ کے علاوہ دوسرے اہل جاہلیت بھی عاشوراء کا روزہ
رکھا کرتے تھے، رسول اکرمؐ بھی اس دور میں عاشوراء کے روزے کے پابند تھے اور اس کا بنیادی
سبب یہ تھا کہ وہ دین حنیفی کا ایک شرعی حکم تھا اور سب حرب ملت حنیفی اور اس کے احکام پر عمل کیا
کرتے تھے جیسے حج اور روزہ کے علاوہ بعض دوسرے احکام وعبادات کا ذکر ملتا ہے گویا یہ روزۂ
عاشوراء دینی اسلامی فریضہ تھا اور عربوں کو ان کے جد امجد حضرت ابراہیم کی شریعت سے ملا تھا۔

ان احادیث نبویؐ میں اور بعض دوسری احادیث شریفہ میں صوم عاشوراء کے تسلسل کا
واضح ذکر ملتا ہے، اس میں سب سے اہم حصہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ اور مسلمان بھی اس کا روزہ رکھا
کرتے تھے جب تک کہ رمضان کے روزے فرض نہ ہوئے،...... وان رسول اللہ ﷺ صامہ
والمسلمون قبل ان یفترض رمضان۔ (مسلم، حدیث: ۱۱۷-۱۱۲۶)

اس کے علاوہ متعدد دوسری احادیث نبویؐ میں بھی صوم عاشوراء کے تسلسل کا ذکر واضح

الفاظ میں ملتا ہے، ان میں سے بعض میں صحابہ کرام کے تعامل کا بھی واضح بیان ہے، مسلم ہی کی
حدیث (۱۲۴) ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلیؓ رمضان سے قبل اس کو رکھا کرتے تھے اور دوسرے
بھی اس کا روزہ رکھتے تھے جیسا کہ حدیث مذکورہ بالا کے متن سے واضح ہوتا ہے: (۱۲۴) وحدثنی
محمد بن حاتم حدثنا اسحاق بن منصور حدثنا اسرائیل عن منصور عن
ابراہیم عن علقمہ قال: دخل الاشعث بن قیس علی ابن مسعود وھو
یاکل یوم عاشوراء فقال: یا ابا عبد الرحمان ان الیوم یوم عاشوراء فقال: قد
کان یصام قبل ان ینزل رمضان، فلما نزل رمضان ترک، فان کنت
مفطرا فاطعم، اس سے قبل حدیث ۱۲۳ میں یہی بات کہی گئی تھی لیکن مختلف انداز سے کہ ہم
اس کا روزہ رکھا کرتے تھے: کنا نصومہ ...... اور اصل روایت ۱۲۲ (۱۱۲۷) میں اس حدیث کا
بنیادی متن ہے، جس میں وضاحت ہے کہ اس دن رسول اللہ ﷺ رمضان کے نزول سے قبل روزہ
رکھا کرتے تھے اور جب رمضان کا نزول ہوا تو ترک کر دیا گیا یا بہ قول ابوکریب آپؐ نے ترک
کردیا...... انما ھو یوم کان رسول اللہ ﷺ یصومہ قبل ان ینزل شہر
رمضان، فلما نزل شہر رمضان ترک وقال ابو کریب: ترکہ۔

رسول اکرمؐ اور دوسرے مسلمانوں کے رمضان کی فرضیت سے قبل روزۂ عاشوراء رکھنے
کے تسلسل سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ رسول اکرمؐ اور آپؐ کے مکی دور کے صحابہ کرام
نے دین حنیفی کے اس حکم کو بعثت نبویؐ کے بعد بھی جاری رکھا تھا اور پورے تیرہ برس تک مکی دور
حیات میں عاشوراء کا روزہ بہ نفس نفیس بھی رکھا کرتے تھے اور مسلمان بھی اس کی پابندی کرتے تھے،
عہد جاہلیت کے خاتمہ پر بعثت نبوی کے بعد روزۂ عاشوراء کے ترک کرنے کا جواز منطقی طور سے
ملتا ہے نہ درایتی لحاظ سے اور حدیثوں میں رمضان کی فرضیت تک عاشورا کا روزہ کرنے کا تسلسل
ثابت کرتا ہے کہ وہ مکی اسلام کا ایک فریضہ تھا۔

مکی اسلام میں روزۂ عاشوراء رکھنے کا حکم نبوی ﷺ

متعدد کتب حدیث میں کئی احادیث اس امر کی ملتی ہیں کہ رسول اکرمؐ نہ صرف بہ نفس نفیس
روزۂ عاشوراء رکھتے تھے بلکہ اس کے رکھنے کا حکم بھی دیا کرتے تھے، گذشتہ حدیث ۲۰۰۱ میں واضح

بیان ہے کہ رسول اکرمؐ نے یوم عاشوراء کے روزے رکھنے کا حکم دیا: ''کان رسول اللہ ﷺ امر بصیام یوم عاشوراء''، حدیث مسلم:۱۱۵ میں ہے کہ رمضان کی فرضیت سے قبل رسول اکرمؐ اس کے روزے رکھنے کا حکم دیا کرتے تھے: ''کان رسول اللہ ﷺ یامر بصیامه قبل ان یفرض رمضان'' حدیث مسلم:۱۱۶ میں قریش کے عہد جاہلی میں روزۂ عاشوراء رکھنے کے معمول کے مابعد رسول اکرمؐ کے رمضان کی فرضیت سے قبل عاشوراء کے روزوں کا حکم دینے کا واضح بیان ہے: ''أن قریشا کانت تصوم عاشوراء فی الجاهلية ثم امر رسول الله ﷺ بصیامه حتی فرض رمضان''۔

صوم عاشوراء کے اس زمرہ کی احادیث نبویؐ کا تعلق بعثت کے بعد کی مکی زندگی سے متعدد وجوہ سے بالکل واضح ہے، اول یہ کہ رسول اکرمؐ لوگوں کو روزۂ عاشوراء رکھنے کا حکم منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد ہی دے سکتے تھے، دوم یہ کہ عہد جاہلی کے ایک دینی فریضہ کو جاہلی عبادت سمجھ کر ترک کر دینے کا رجحان پیدا ہو سکتا تھا جیسا کہ صفا و مروہ کے سعی کے باب میں ہوا، رسول اکرمؐ نے اپنے حکم نبویؐ سے ثابت کیا کہ وہ محض ایک جاہلی عبادت اور ایک غیر ضروری سنت نہیں ہے بلکہ اپنے حکم سے اسے مسلمانوں کے لیے فرض قرار دے دیا، اس پر مفصل بحث جو بعد میں آئے گی، سوم رسول اکرمؐ بہ قول شاہ ولی اللہ دہلویؒ ملت حنیفیہ اور دین ابراہیمی کے احیا کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے، روزۂ عاشوراء دین ابراہیمی میں اسی طرح فرض تھا جس طرح نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام فرض تھے، آپؐ نے ان کو محض جاری نہیں رکھا بلکہ ان کی فرضیت شریعت محمدی میں اپنے امر و حکم سے ثابت فرمادی تھی، قدیم و جدید شارحین حدیث نے اپنے تبحر علمی اور مہارت فنی کے باوجود روزۂ عاشوراء کے رکھنے کے حکم نبوی کی زمانی توقیت نہیں کی، غالباً ان کو صوم عاشوراء رکھنے سے متعلق احادیث نبوی کے دوسرے طبقہ میں زمانی توقیت سے غلط فہمی ہوگئی۔

اوائل مدنی دور میں روزۂ عاشوراء کا حکم نبوی ﷺ

تقریباً تمام کتب حدیث میں بالخصوص موطا امام مالک، صحیحین بخاری و مسلم اور سنن ترمذی وابوداؤد وغیرہ میں رسول اکرمؐ کی احادیث شریفہ کا دوسرا زمرہ ملتا ہے جس میں یہ صراحت پائی جاتی ہے کہ رسول اکرمؐ جب مدینہ تشریف لائے تو عاشوراء کا روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی اس کے

روزے رکھنے کا حکم دیا اور جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو وہ فرض حکم بن گئے اور عاشوراء متروک یا اختیاری یا مسنون بن گیا، ان احادیث میں دل چسپ بات یہ ہے کہ عہد جاہلی میں قریش کے روزۂ عاشوراء رکھنے سے بات شروع ہوتی ہے اور وہ رسول اکرمؐ کے روزے رکھنے کے معمول کو بھی محیط ہے، ترتیب سے تمام احادیث نبویؐ کے متون ملاحظہ ہوں:

۱- مالک عن هشام بن عروة بن ابیه عن عایشةؓ زوج النبی ﷺ انها قالت: کان یوم عاشوراء یوما تصومه قریش فی الجاهلية و کان رسول الله ﷺ یصومه فی الجاهلية فلما قدم رسول الله ﷺ المدینة صامه و امر الناس بصیامه فلما فرض رمضان کان هو الفریضة وترک یوم عاشوراء، فمن شاء صامه ومن شاء ترکه۔ (موطا، اوجز المسالک ۳/۵۰)

۲- ۲۰۰۲، حدثنا عبد الله بن مسلمة عن مالک عن هشام بن عروة عن ابیه عن عایشةؓ قالت: کان یوم عاشوراء تصومه قریش فی الجاهلية وکان رسول الله ﷺ یصومه فی الجاهلية فلما قدم المدینة صامه وامر بصیامه فلما فرض رمضان ترک یوم عاشوراء، فمن شاء صامه ومن شاء ترکه۔ (بخاری، فتح الباری ۴/۳۱۰)

۳- (۱۱۳)(۱۱۲۵): حدثنا زهیر بن حرب حدثنا جریر عن هشام بن عروة عن ابیه عن عایشةؓ قالت: کانت قریش تصوم عاشوراء فی الجاهلية وکان رسول الله ﷺ یصومه فلما هاجر الی المدینة صامه وامر بصیامه فلما فرض شهر رمضان قال: من شاء صامه ومن شاء ترکه۔ نیز حدیث ۱۱۴(۱۱۵) حدثنا حرملة بن یحیی اخبرنا ابن وهب اخبرنی یونس عن ابن شهاب اخبرنی عروة بن الزبیر ان عایشةؓ قالت: کان رسول الله ﷺ یامر بصیامه قبل ان یفرض رمضان، فلما فرض رمضان کان من شاء صام یوم عاشوراء ومن شاء افطر، نیز حدیث:۱۱۶، مسلم، نووی ۲/۱۹۸-۱۹۹ و مابعد۔

۴- حدثنا هارون بن اسحاق الهمدانی نا عبدة بن سلیمان عن

هشام بن عروة عن ابيه عن عايشة قالت : كان عاشوراء يوم تصومه قريش في الجاهلية وكان رسول الله ﷺ يصومه فلما قدم المدينة صامه وامر الناس بصيامه فلما افترض رمضان كان رمضان هو الفريضة وترك عاشوراء فمن شاء صامه ومن شاء تركه۔ (ترمذی ، معارف السنن ۵/۴۳۵-۴۳۶)

ان تمام احادیث نبویہ کو دوسرے زمرے میں اس لیے رکھا کہ ان سب میں عاشوراء کے روزے رکھنے کا حکم نبویؐ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد ملتا ہے یعنی یہ صراحت پائی جاتی ہے کہ رسول اکرمؐ نے مدینہ آنے کے بعد اس کے روزے رکھنے کا حکم دیا تھا، لہذا اتمام کے تمام شارحین حدیث نے اس سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ عاشوراء کے روزے رکھنے کا حکم مدنی ہے، اس کا دوسرا اطلاقی پہلو یہ نکالا کہ مکی دور میں رسول اکرمؐ کے روزۂ عاشوراء رکھنے کے حکم کو نظرانداز کردیا گیا، گویا کہ آپؐ نے مکی دور حیات میں عاشوراء کا روزہ رکھنے کا حکم دیا ہی نہیں تھا جیسا کہ ان احادیث نبویہ میں ملتا ہے۔

حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ عہد جاہلیت کے خاتمہ پر بعثت کے بعد رسول اکرمؐ نے روزۂ عاشوراء رکھنے کا اولین حکم مکہ مکرمہ میں دیا تھا جس کا واضح ذکر بلا حوالہ ہجرت وقدوم مدینہ اول الذکر طبقہ احادیث نبویؐ میں ملتا ہے اور جو اوپر آچکیں، اس دوسرے طبقۂ احادیث میں جو حکم ملتا ہے وہ بلاشبہ مدنی ہے مگر وہ دوسرا حکم نبوی ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد رسول اکرمؐ نے دیا تھا، وہ اصلاً مکی حکم نبوی کی توسیع تھی کہ جو حکم عاشوراء کے روزے کے بارے میں تھا وہ مدینہ میں بھی باقی ہے اور اس کا سبب یہ تھا کہ مدینہ آتے ہی یعنی اولین محرم میں رسول اکرمؐ اور مسلمانان مکہ نے یہودیوں کو اس دن کا روزہ رکھتے دیکھا تو خیال فرمایا کہ مہاجرین کو یہودی روایت سے کوئی غلط فہمی نہ ہو لہذا دوسرا حکم تاکیداً نافذ فرمایا، جیسا کہ بعثت کے بعد اولین حکم مکی اسلام کے زمانے میں عطا فرمایا تھا کہ روایت جاہلی اصل نہیں ہے بلکہ دین حنیفی کا حکم اصل ہے اور وہ مکی و مدنی دونوں ادوار میں قایم و نافذ ہے۔

مکی اسلام میں روزۂ عاشوراء کی فرضیت ہو یا مدنی دور کے اوایل میں اس کی فرضیت کا

معاملہ ہو، دونوں طرح کی احادیث مبارکہ ایک ہی صحابی حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں اور ان سے روایت کرنے والے حضرت عروہ بن زبیر تابعی جلیل ہیں، ان کی دو طرح کی احادیث کو ایک ہی قسم کی سمجھ لیا گیا، حالاں کہ وہ درحقیقت دو الگ الگ زمانوں سے متعلق و وابستہ ہیں، اول مکی عہد سے متعلق وہ احادیث ہیں جن میں قریش کے روزہ رکھنے اور رسول اکرمؐ کے معمول کے علاوہ حکم نبوی کا حوالہ ہے، ان میں کسی زمانے یعنی حکم نبوی کا حوالہ یا ذکر نہیں پایا جاتا بلکہ رسول اکرمؐ کا روزۂ عاشوراء رکھنے اور اس کا روزہ رکھنے کا حکم دینے کا ذکر ہے، یعنی یہ حکم عام ہے اور اس میں توقیت زمانی نہیں ہے لہذا تسلسل کے سبب اس کو مکی حکم سمجھنا چاہیے، دوسری وہ احادیث ہیں جن میں ہجرت مدینہ کے بعد آپؐ کے روزۂ عاشوراء رکھنے اور اس کا حکم دینے کا واضح ذکر ہے اور دوسرا حکم نبوی ہے، شارحین کرام نے ان دونوں قسم کی احادیث کو ایک ہی زمانہ کا مان لیا اور دونوں کا زمانہ مدنی دور کا متعین کردیا کیوں کہ دوسری قسم کی احادیث میں مدنی دور کی صراحت ملتی ہے، حالاں کہ دونوں کے الگ الگ متون ہیں جو خود پوری طرح اپنی اپنی توقیت کرتے ہیں، مطلق کو مقید کرنے کا جو اصول وضابطہ پایا جاتا ہے اس نے ساری غلط فہمی پیدا کی ہے، ورنہ صورت حال بالکل واضح ہے۔

روزۂ عاشوراء کی فرضیت

رمضان المبارک کے روزوں سے پہلے عاشوراء کے روزے کے بارے میں ائمۂ مجتہدین اور ان کے پیروؤں کا اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ فرض تھا، سنت تھا یا صرف مستحب تھا، جیسا کہ اب علما وفقہائے اسلام کا اجماع ہے کہ وہ سنت نبوی ہے، امام نووی نے بالخصوص اور دوسرے شارحین حدیث نے اس مسئلہ پر مختصر مگر جامع بحث کی ہے اور ہر ایک امام کے دلایل بھی دیے ہیں، امام ابوحنیفہؒ کا واضح فتوی ہے کہ رمضان سے قبل وہ فرض تھا، امام اعظم کی دلیل یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے عاشوراء کے روزوں کا حکم دیا تھا اور امر نبوی وجوب وفرضیت کو ثابت کرتا ہے" فقال ابو حنيفة : كان واجبا ...... و يتمسك ابو حنيفة بقوله : امر بصيامه والامر للوجوب" (المنهاج ۱۹۹/۲)۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے صحیح بخاری کی دوسری حدیث باب کی شرح میں اور تیسری حدیث کی شرح میں بھی اس کے وجوب کے قائلین کے قول کی صحت کو ثابت کیا ہے اگرچہ ان کی

تعیین زمانی یا فرضیت عاشوراء کی بحث غیر اتفاقی ہے، بہر حال ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے مدینہ منورہ کے اولین سال میں روزہ عاشوراء کا حکم دیا اور دوسرے برس رمضان کے روزوں کی فرضیت کا اعلان فرمایا اور اسی کے ساتھ روزۂ عاشوراء مستحب بن گیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ فرضیت رمضان نے فرضیت عاشوراء کو منسوخ کر دیا جیسا کہ ان صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے بہذا ثابت ہوا کہ پہلے روزۂ عاشوراء فرض تھا۔

"...... وافادت تعیین الوقت الذی وقع فیه الامر بصیام عاشوراء وقد کان اول قدومه المدینة ...... وفی السنة الثانیة فرض شهر رمضان فعلی هذا لم یقع الامر بصیام عاشوراء الا فی سنة واحدة ثم فرض الامر فی صومه الی رای المتطوع، فعلی تقدیر صحة قول من یدعی انه کان قد فرض فقد نسخ فرضه بهذه الاحادیث الصحیحة ......"۔

حافظ موصوف اس خیال سے زیادہ بڑھ کر روزۂ عاشوراء کی دائمی فرضیت کے قائل بعض سلف کا ذکر قاضی عیاض یحصبیؒ کے حوالے سے کیا ہے لیکن اس کی دائمی فرضیت کے قائلین میں سے اب کوئی نہیں رہا، "...... ونقل عیاض ان بعض السلف کان یری بقاء فرضیة عاشوراء لکن انقرض القائلون بذلک ......" (فتح الباری ۴/۳۱۲) تیسری حدیث باب کی شرح میں حافظ موصوف نے لکھا ہے کہ مجموعۂ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ واجب تھا کیوں کہ اس کے روزے کا حکم نبوی ثابت ہے ...... انہوں نے امام مسلم کی حدیث حضرت ابن مسعودؓ کہ "جب رمضان فرض ہوا تو عاشوراء متروک ہوگیا" سے مزید دلیل پکڑی ہے کہ روزۂ عاشوراء کا استحباب ابھی موجود ہے اور وہ متروک نہیں ہوا لہذا اس سے ثابت ہوا کہ اس کا وجوب متروک ہوا اور احادیث صحیحہ اور علما وفقہا کے اجماع اور دوسرے تمام شواہد سے نہ صرف اس کا استحباب باقی ہے بلکہ مؤکد ہے۔

"...... ویؤخذ من مجموع الاحادیث انه کان واجبا لثبوت الامر بصومه ثم تاکد الامر بذلک ...... وبقول ابن مسعود الثابت فی مسلم "لما فرض رمضان ترک عاشوراء" مع العلم بانه ما ترک استحبابه بل هو باق فدل

علی ان المتروک وجوبه واما قول بعضهم المتروک تاکد استحبابه والباقی مطلق استحبابه فلا یخفی ضعفه بل تاکد استحبابه باق ......" (فتح الباری ۴/۳۱۳)، بعد کے شارحین حدیث اور علما وفقہا نے رمضان سے قبل روزۂ عاشوراء کی فرضیت و وجوب کا ذکر کیا ہے اور ان کے تمام مباحث ودلایل امام نووی اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی تشریحات ومباحث پر مبنی ہیں بلکہ ان ہی سے مستعار ہیں، بعض متاخر شارحین کرام نے ان کے دلایل سے بھی بحث نہیں کی ہے بلکہ صرف امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کی ہے، البتہ بعض مقامات پر یا بعض شارحین نے ایک دو الفاظ میں تبدیلی کر دی ہے اور کسی ایک کا نام بڑھا دیا ہے، جیسے علامہ محمد یوسف بنوری اور شیخ الحدیث محمد زکریا کاندھلوی اور دوسری شروح صحاح کے مولفین کرام نے کیا ہے (معارف السنن ۵/۴۳۲، اوجز المسالک ۳/۴۹-۵۰)۔

امام شافعیؒ بھی رمضان سے قبل روزۂ عاشوراء کو فرض قرار دینے کے قول سے متفق ہیں اگرچہ ان سے دوسرا قول استحباب کا بھی مروی ہے، امام نووی نے فقہی بحث کے علاوہ تاریخی دلایل اور حدیثی بنیاد پر ثابت کیا ہے کہ ان کے دو اقوال میں سے فرضیت عاشوراء کا قول زیادہ صحیح ہے، اس میں اصحاب امام کا اختلاف زیادہ پایا جاتا ہے نہ کہ حضرت امام کا، "واختلف اصحاب الشافعی فیه علی وجهین مشهورین: اشهرهما عندهم انه لم یزل سنة من حین شرع ولم یکن واجبا قط فی هذه الامة ولکنه کان متاکد الاستحباب فلما نزل صوم رمضان صار مستحبا دون ذلک الاستحباب والثانی کان واجبا کقول ابی حنیفة ......" (المنهاج ۲/۱۹۹)

حقیقت یہ ہے کہ روزۂ عاشوراء کا وجوب رمضان سے قبل ملتا ہے اور یہی مسلک امامین ہے، بعد کے اصحاب کا مسلک دوسری احادیث پر مبنی ہے۔

فرضیت عاشوراء کا زمانہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس حدیث حضرت عائشہؓ کی بنا پر زمانہ فرضیت کی تعیین کی ہے، جس میں یہ صراحت ملتی ہے کہ رسول اکرمؐ نے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد روزۂ عاشوراء رکھنے کا حکم دیا تھا، وہ صحیح بخاری کی حدیث ہے، اگرچہ وہ صحیح مسلم میں بھی ہے لیکن حافظ موصوف کی پوری بحث کا دار ومدار اسی مدنی حکم نبوی پر ہے، حافظ موصوف نے اس

ضمن میں امام مسلم کی ان احادیث حضرت عائشہؓ سے سروکار نہیں رکھا ہے جن میں زمانہ امر کا حوالہ نہیں اور جن کو ہم نے مطلق حکم نبوی کے درجے میں رکھ کر ان کے مکی ہونے کا حکم لگایا ہے، پہلے حافظ موصوف کی بحث کا خلاصہ پیش ہے۔

"باب صیام یوم عاشوراء" کی دوسری حدیث پر بحث کرتے ہوئے حافظ عالی مقام نے ایک حدیث کا اولین جملہ نقل کیا ہے "کہ اہل جاہلیت اس کا روزہ رکھا کرتے تھے اور زمانہ جاہلیت میں نبیؐ بھی اس کا روزہ رکھا کرتے تھے" اور پھر اس کی زمانی تعیین کی ہے کہ آپؐ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے قبل اس کا روزہ رکھا کرتے تھے، یہ بہت اہم تشریح ان کے الفاظ میں یوں ہے: "...... ان اهل الجاهلية كانوا يصومونه وان النبی ﷺ كان يصومه فی الجاهلية "ای قبل ان يهاجر الی المدينة ......" (۳۱۲/۴)، اگرچہ بعثت نبوی کے بعد تیرہ سالہ مکی دور کو زمانہ جاہلیت کا حصہ قرار دینا محل نظر ہے اور حافظ متبحر سے سہو خیال ہوا ہے تاہم رسول اکرمؐ کا بعثت سے قبل اور بعثت و رسالت کے بعد روزۂ عاشوراء رکھنے کا معمول و سنت ہے، بعثت سے قبل معمول اور عمل بر سنت ابراہیمی و اسماعیلی اور بعد نبوت و رسالت مکی اسلام کا ایک حکم الٰہی اور فرض ربانی، مکی دور نبوی میں اس کے فریضہ اسلامی بننے کے ماٰخذ پر بعض علمائے حدیث اور متبحرین اسلام نے بحث و مباحثہ کیا ہے، بعض کا خیال ہے کہ شریعت حنفی کی موافقت کا حکم مطلق پایا جاتا ہے لہذا آپ نے اس کو اسلام میں جاری رکھا یا اللہ تعالیٰ نے اس کے روزوں کی اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ ایک نیکی کا کام ہے ...... بہر حال رسول اکرمؐ اسے مکی دور میں رکھتے رہے اور اس میں اتباع یہود کا شایبہ نہیں تھا" وصوم رسول اللہ ﷺ يحتمل ان يكون بحكم الموافقة لهم كما فی الحج او اذن الله له فی صيامه علی انه فعل خير ...... وعلى كل حال فلم يصمه اقتداء بهم (ای اليهود) فانه كان يصومه قبل ذلك وكان ذلك فی الوقت الذی يحب فيه موافقة اهل الكتاب فيما لم ينه عنه ...... (فتح الباری ۳۱۴/۴)، چوں کہ حدیث حضرت عائشہؓ میں جو بخاری میں منقول ہے، مدینہ منورہ جانے کے بعد رسول اکرمؐ کا حکم و امر ملتا ہے کہ روزۂ عاشوراء رکھا جائے لہذا حافظ موصوف نے اس کو مدنی حکم قرار دیا ہے۔

مکی دور نبوی میں فرضیت عاشوراء

صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایات ایسی ہیں جن میں رسول اکرمؐ کے روزۂ عاشوراء رکھنے اور ان کے روزے رکھنے کا حکم دینے دونوں کا ذکر بلا تعیین زمانہ ملتا ہے، جیسے حدیث بخاری: ۲۰۰۱ میں ہے: كان رسول الله ﷺ امر بصيام يوم عاشوراء ...... حدیث مسلم (۱۱۵) میں ہے: كان رسول الله ﷺ يامر بصيامه قبل ان يفرض رمضان ...... اور اس سے زیادہ اہم حدیث (۱۱۶) ہے "ان قريشا تصوم عاشوراء فی الجاهلية ثم امر رسول الله ﷺ بصيامه حتی فرض رمضان۔

مذکورہ بالا احادیث نبوی میں مطلق حکم روزہ ہے اور حدیث مسلم: ۱۱۶ میں قریش کے معمول روزہ اور رسول اکرمؐ کے حکم روزہ کے درمیان کسی زمانی وقفہ کا حوالہ ہے، نہ قرینہ اور نہ ہی ذکر، اس کا واضح مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ عہد جاہلیت کے خاتمہ پر یعنی بعثت نبویؐ کے معاً بعد یا کچھ مدت بعد جب محرم الحرام کا عاشوراء آیا تو آپؐ نے نہ صرف اس کا روزہ رکھا بلکہ مکی دور کے مسلمانوں کو اس روزہ کو رکھنے کا حکم بھی دیا تاکہ واضح ہوجائے کہ وہ جاہلی روایت اور سنت ابراہیمی کی پیروی اور شریعت حنفی کی اتباع ہی نہیں بلکہ وہ اسلامی حکم ہے جو شریعت محمدی میں بھی واجب ہے۔

چوں کہ بعض طبقۂ احادیث حضرت عائشہ صدیقہؓ میں مدینہ پہونچنے کے بعد روزۂ عاشوراء رکھنے کا حکم ملتا ہے لہذا عام شارحین حدیث نے حکم نبوی کو نہ صرف مدنی قرار دیا بلکہ ان مطلق احکام والی روایات کو جو مکی احادیث ہیں، انہیں مدنی احادیث پر محمول کر کے روزۂ عاشوراء کے حکم نبوی کو خالص اور واحد مدنی حکم بنا دیا، حالاں کہ دوسری مدنی احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں جو روزۂ عاشوراء کو رکھنے کا حکم دیا تھا وہ مدنی یہود کے معمول دیکھنے کے بعد دیا تھا تاکہ مسلمانان مدینہ اسے یہودی سنت و موسوی روایت جان کر اس سے اجتناب نہ کریں بلکہ اس کو حسب سابق اسلامی حکم سمجھیں، جیسا کہ بخاری کی حدیث: ۲۰۰۴ - ۲۰۰۵ اور مسلم کی حدیث: (۱۲۷) (۱۱۳۰) (۱۲۸) وغیرہ سے واضح ہوتا ہے۔

حدیثی شواہد کے ساتھ ساتھ درایتی اصول و شہادات بھی ثابت کرتے ہیں کہ روزۂ عاشوراء کا اولین حکم نبوی بعثت کے بعد پہلے عاشوراء سے چند دنوں پہلے کا ہے، قریش، دوسرے اہل جاہلیت اور رسول اکرمؐ کے ساتھ مکی مسلمان بھی روزۂ عاشوراء رکھتے تھے، اسلام آنے کے بعد مسلمانوں

کے سامنے روزۂ عاشوراء کی اسلامی شرعی حیثیت کا مسئلہ یقیناً در پیش ہوا، انہوں نے رسول اکرمؐ سے استفسار کیا یا آپؐ نے بہ نفس نفیس ضرورت محسوس فرمائی تو روزہ عاشوراء رکھنے کا حکم۔ اولین مکی حکم۔ فرمایا تاکہ سب کے سامنے واضح ہو جائے کہ وہ ایک اسلامی حکم و فرض بن گیا ہے۔

ایک دوسری منطقی دلیل یہ بھی ہے کہ بعثت نبوی کے بعد تیرہ برسوں کو محیط مکی دور میں روزۂ عاشوراء کی شرعی حیثیت کیا تھی؟ علمائے اسلام اور شارحین حدیث سب کا تقریباً اجماع و اتفاق ہے کہ رمضان کے روزوں سے قبل فرض تھا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روزۂ عاشوراء حکم نبوی کے سبب فرض ہوا تو مکہ مکرمہ میں ہوا یا مدینہ منورہ میں وہ فرض بنا؟ تمام روایات، آرا اور احادیث کا اس پر بھی اجماع ہے کہ وہ رمضان کی فرضیت سے قبل مسلم امت کے لیے فرض روزہ تھا، منطقی طور سے بھی اور نقلی طور سے بھی یہ امکان نہیں کہ مکی دور میں وہ نفل و اختیاری رہا ہو اور مدینہ منورہ کے اولین سال میں فرض مقرر ہوا ہو، اس لیے کہ تمام مجموعہ احادیث کا اجتماعی فیصلہ اور اجماعی حکم یہی ہے کہ وہ فرضیت رمضان سے قبل فرض اسلامی حکم نبوی تھا اور پورے تیرہ برس کے مکی دور میں بھی وہ فرض حکم اور فرض اسلامی تھا، کم از کم اب تک ایک رائے بھی اس کے خلاف نہیں ملی اور کسی ایک امام و فقیہ نے بھی نہیں فرمایا کہ وہ مکہ مکرمہ کے زمانے میں نفل تھا، سب کا اتفاق ہے کہ وہ فرضیت رمضان سے قبل فرض ہی تھا۔

یہ نری منطقی بحث اور استدلالی نتیجہ نہیں ہے اس کو مجموعی احادیث کی روح کی تائید و توثیق تو حاصل ہے ہی بعض اور احادیث و روایات کی تصدیق و استناد بھی فراہم ہے، خاص کر ان احادیث کی جن میں یہ ذکر ہے کہ روزۂ عاشوراء جاہلیت میں رکھا جاتا تھا اور جب اسلام آیا تو وہ مسنون و مستحب بن گیا: ''ان یوم عاشوراء کان یصام فی الجاهلیة فلما جاء الاسلام من شاء صامه و من شاء ترکه'' ۔حدیث مسلم ۱۱۴۔ امام نووی اور دوسرے شارحین کرام نے وضاحت کی ہے کہ اسلام آنے سے یہاں مراد رمضان کی فرضیت ہے، ظاہر ہے کہ اسلام رمضان کے ساتھ روزۂ رمضان کی فرضیت کے ساتھ مدینہ میں نہیں آیا تھا۔

امام قرطبی (ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری خزرجی) نے اپنی تفسیر قرطبی میں سورۂ بقرہ کی آیت کریمہ ۱۸۳ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ فرمان الٰہی: کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ الخ سے مراد یہ

ہے کہ شروع اسلام میں ہر ماہ کے تین دن اور یوم عاشوراء کے روزے فرض کیے گئے تھے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے: ''کَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' اور ان سے مراد بہ قول حضرت ابن عباسؓ یہود ہیں جن پر اسی طرح سے ہر ماہ کے تین روزے اور یوم عاشوراء کا فرض کیا گیا تھا، پھر اس امت کے حق میں ان روزوں کو رمضان کے ماہ سے منسوخ کیا گیا، المعنی: ''کتب علیکم الصیام'' ای فی اول الاسلام ثلاثة ایام من کل شهر و یوم عاشوراء کما کتب علی الذین من قبلکم وهم الیهود - فی قول ابن عباس - ثلاثة ایام و یوم عاشوراء، ثم نسخ هذا فی هذه الامة بشهر رمضان ......، امام قرطبی کے مطابق اولین حکم روزہ کی تنسیخ حضرت معاذ بن جبلؓ کے مطابق ایت کریمہ کے اگلے حصے ایاما معدودات (چند دنوں) سے ہوئی تھی اور ان کا نسخ رمضان سے ہوا تھا: ''وقال معاذ بن جبل: نسخ ذلک "ایام معدودات" ثم نسخت الایام برمضان (الجامع لاحکام القرآن، تحقیق عبدالرزاق المهدی، دار الکتاب العربی بیروت ۲۰۰۰ء، ۲/۲۷۱) امام موصوف نے ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے متعلق اگلی آیت کریمہ ۱۸۴ میں بھی تین دن ہر ماہ کے اور یوم عاشوراء کے روزوں کی فرضیت کا قول دہرایا ہے:

فمن قال: ان الصیام فی قوله ''کتب علیکم الصیام'' هی ثلاثة ایام و عاشوراء قال هنا بالابتداء۔ (تفسیر قرطبی، ۲/۲۹۲)

گذشتہ شریعتوں میں خواہ شریعت ابراہیمی کا معاملہ ہو یا شریعت موسوی و عیسوی کا، اصل دین حنفی ہی تھا، نہ صرف قرآن مجید کی آیات کریمہ اس کی شہادت دیتی ہیں بلکہ یہود و نصاریٰ بھی شریعت و دین ابراہیمی کے ماخذ ہونے کا اقرار کرتے ہیں، عبادات و احکام میں تمام اسلامی شریعتوں میں ایک مماثلت اور ایک جیسا ارتقائی سلسلہ نظر آتا ہے بلکہ بعض احکام یکساں ہی ہیں، ان بعض احکام کو بنیادی احکام بھی کہا جا سکتا ہے، ایمانیات کے علاوہ عبادات میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سب میں مشترک رہے ہیں، دوسرے احکام و عبادات سے قطع نظر، صرف روزہ کا حکم اور صوم کی عبادت تمام اسلامی شریعتوں اور دینی مظاہر میں یکساں رہی ہے۔

مفسرین کرام، فقہائے عظام اور علمائے اسلام نے اسی بنا پر روزۂ اسلامی کا سابقہ شرعی ماخذ

تلاش کیا ہے، گذشتہ قوموں پر روزوں کی فرضیت تو قرآن مجید سے ثابت ہے ہی جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت کریمہ -۱۸۳ کے حوالے سے اوپر گذر چکا ہے، امام قرطبی اور دوسرے مفسرین کرام نے ان روزوں کی تعداد اور زمانہ بھی اسی بنا پر متعین کیا ہے اور روایات شریعت سابقہ نقل کی ہیں، حضرات امام شعبی اور امام قتادہ وغیرہ کے مطابق قوم موسیٰ وعیسیٰ پر بھی رمضان کے روزے فرض تھے اور بعض اقوال کے مطابق حضرت نوحؑ کے وقت سے وہ فرض تھے لیکن انہوں نے ان کو بدل دیا، بہر حال انہوں نے پچاس روزے اپنے اوپر قرار دے لیے تھے جن میں کتر بیونت کی گئی۔

قریش اور اہل جاہلیت کے زمانے میں ہر ماہ کے تین روزے اور یوم عاشوراء کا سالانہ روزہ فرض وواجب باقی رہا، بعثت سے قبل عربوں میں ان روزوں کا رواج اور ان کے رکھنے کا معمول تھا، رسول اکرمؐ نے بعثت سے قبل ان روزوں کو رکھا، نبوت ورسالت کے بعد بھی ان روزوں کو - ہر ماہ کے تین دنوں اور ہر سال کے عاشوراء کے روزے کو جاری رکھا کہ وہ اسلامی حکم تھا یا رسول اکرمؐ نے اپنے نبوی عمل اور قولی حکم سے اسے اسلامی حکم بنا دیا تھا، احادیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ مکی دور حیات کے تیرہ برسوں میں ہر ماہ کے تین دنوں اور عاشوراء کا روزہ رکھا کرتے تھے جیسا کہ حدیث مسند امام احمد بن حنبلؒ سے ثابت ہوتا ہے، اس حدیث میں روزہ کا ارتقائی اسلامی اصول وواقعہ بھی بیان کیا گیا ہے لہذا ان تمام شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ عاشوراء کا روزہ مکی دور میں اسلام آنے کے بعد فرض ہوا تھا جس طرح نماز فرض ہوئی تھی اور دوسرے احکام و عبادات، صدقہ وزکوۃ وحج فرض قرار دیے گئے تھے (تفسیر قرطبی ۲/۲۷۰-۲۷۱، تفسیر ابن کثیر ۱/۲۱۳-۲۱۴ نیز ومابعد، احمد عبد الرحمن البنا الشهير بالساعاتی، بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی، مصر ۱۳۵۷ھ، ۹/۲۳۹: "واحیل الصیام ثلاثة احوال: ...... واما احوال الصیام فان رسول الله ﷺ قدم المدینة فجعل یصوم من کل شهر ثلاثة ایام وقال یزید: فصام سبعة عشر شهرا من ربیع الاول الی رمضان من کل شهر ثلاثة ایام وصام یوم عاشوراء ثم ان الله عزوجل فرض علیه الصیام فانزل الله عزوجل: یا ایها الذین امنوا کتب علیکم الصیام ...... الخ"۔ (کتاب الصیام باب الاحوال التی عرضت للصیام و

وجوب صیام رمضان و مبدا فرضه :۲۱- حدیث معاذ بن جبلؓ)

حافظ ابن کثیر دمشقی نے بھی امام احمد کی مسند سے اس حدیث نبوی کو نقل کر کے ارتقا پر بحث کی ہے، اس حدیث نبوی کے راوی ایک مدنی صحابی ہیں، لہذا وہ مدینہ منورہ میں نبوی معمول روزہ کے تین ارتقائی سلسلوں کا ذکر کرتے ہیں جس طرح وہ اس حدیث کے اولین حصہ میں نماز کے تین ارتقائی مظاہر کا بیان پیش کرتے ہیں کہ جب آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو نماز کے تین "احوال" میں سے ایک یہ تھا کہ سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے، وغیرہ الخ، ظاہر ہے کہ نماز کے ان احوال میں سے بعض مدنی دور کے نہیں تھے بلکہ مکی تھے بالخصوص بیت المقدس کو قبلہ بنانا وغیرہ، اسی طرح روزہ کے تین احوال: ۱- ہر ماہ کے تین روزے، ۲- یوم عاشوراء کا روزہ، ۳- رمضان کے ماہ بھر کے روزے، ان میں سے اولین دو مکی تھے، حضرت معاذؓ کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ دونوں اولین احوال بھی مدنی تھے بلکہ مدینہ ہجرت کے بعد ان دونوں مکی احوال روزہ کو جاری رکھا، تیسرا "حال نماز" یعنی کعبہ کا قبلہ مقرر ہونا اور روزہ کا تیسرا حال یعنی صیام رمضان کا فرض ہونا ہی مدنی حال نماز وروزہ ہے، بہر حال اس حدیث سے بھی اور دوسری احادیث کے مجموعے سے جو چیز سب سے اہم ثابت ہوتی ہے وہ ارتقائی سلسلہ ہے، اس کا اولین رشتہ شریعت حنفی سے وابستہ ہے، جس نے قریش ودوسرے عربوں سے ایام جاہلیت میں یوم عاشوراء رکھوایا، دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ بعثت سے قبل رسول اکرمؐ نے بھی اسی ملت ابراہیمی اور دین حنفی کی پیروی میں اس کا روزہ رکھا، تیسرا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ اسی کو بعثت نبوی کے بعد بہ طور اسلامی حکم وفریضہ جاری رکھا، لہذا یوم عاشوراء کے روزے کی فرضیت ہوئی اور وہ مکہ مکرمہ میں اولین محرم بعد نبوت ہوئی تھی اور پورے مکی دور میں لگ بھگ تیرہ برس قایم ودایم اور جاری ساری رہی، چوتھا اہم نکتہ یہ ہے کہ بعد ہجرت مدینہ عاشوراء کا روزہ مسلمانوں پر سابقہ حکم اسلامی کے سبب فرض وواجب بنا رہا اور سترہ ماہ تک اس کی فرضیت قایم رہی البتہ اس فرض پر عمل مدینہ منورہ میں صرف ایک سال یعنی ۲ھ میں ہی ہوسکا کیوں کہ اسی سال رمضان کے روزوں نے عاشوراء کے روزے کو نفل بنا کر اس کی فرضیت منسوخ کردی۔

مدنی دور نبوی میں روزۂ عاشوراء

رسول اکرمؐ اور مکی و غیر مکی مہاجرین ہجرت کے بعد جب مدینہ پہنچے تو عاشوراء کے روزے کی فرضیت لے کر پہنچے، قریشی مسلمانوں اور دوسرے مکی اہل ایمان پورے مکی دور میں عاشوراء کا روزہ بہ طور ایک فرض و فریضۂ اسلامی رکھا کرتے تھے، لہذا جب وہ مدینہ منورہ پہنچے تو یوم عاشوراء کے روزے کی فرضیت کا حکم الٰہی یا امر نبوی واضح طور سے موجود تھا، مدینہ پہنچنے کے بعد رسول اکرمؐ نے غالباً یہودی روزۂ عاشوراء کے نظریہ و عمل کے پیش نظر اس اسلامی روزہ کو رکھتے رہنے کا تازہ حکم نافذ فرمایا تاکہ اہل ایمان پر واضح رہے کہ یہودی سنت و روایت اپنی جگہ، اسلامی صوم عاشوراء کا فرض برقرار ہے، اسی لیے متعدد احادیث نبوی میں واضح ذکر آتا ہے کہ نہ صرف آپؐ نے یوم عاشوراء کا روزہ حسب معمول مکہ رکھا، بلکہ اس کے روزے رکھنے کا تازہ اور دوسرا حکم مسلمانوں کو دیا، کیوں کہ اگر کسی غلط فہمی یا الجھن یا سوال کا وہ شکار ہوں تو وہ دور ہو جائے، احادیث میں سوال و الجھن کا قرینہ ہی نہیں باقاعدہ استفسار صحابہ کا حوالہ و ذکر ملتا ہے۔

ہجرت مدینہ ربیع الاول کے ماہ میں مکمل ہوئی، لگ بھگ دس گیارہ ماہ بعد جب محرم کا عاشوراء آیا تو اس کے روزے کا سوال اٹھا، شارحین حدیث اور علمائے اسلام نے اپنی مباحث و تشریحات میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ یوم عاشوراء کے روزے کے بارے میں رسول اکرمؐ کے مدنی حکم اولین کے وقت کا زمانہ پہلے محرم لگ بھگ کا تھا، ظاہر ہے کہ رسول اکرمؐ کو اور مکی اور دوسرے مہاجرین کو اس وقت تک یہودی روایت روزہ کا علم ہو چکا تھا جیسا کہ بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ آتے ہی (بعد مقدمة المدينة) آپؐ کو اس کا قطعی اور پکا علم ہو چکا تھا، اسی لیے آپؐ نے روزۂ عاشوراء رکھنے کا حکم دیا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے قبل محرم ۲ھ میں روزۂ عاشوراء کا حکم نبوی اس کے فرض بجالانے کے لیے تھا یعنی آپؐ نے اسلامی روزۂ عاشوراء کا فرض ادا کرنے کا حکم دیا تھا یا یہودی روایت کی پیروی اور شریعت موسوی کی اتباع میں اس کے نفل ادا کرنے کا حکم دیا تھا؟ اس کا واحد جواب یہ ہے کہ اولین مدنی محرم کا روزۂ عاشوراء بہ طور اسلامی روزہ اور بہ طور فرض رکھا گیا تھا اور اسی فرض کی ادائگی کا حکم آپؐ نے دیا تھا، رمضان کی فرضیت سے قبل نہ تو روزۂ عاشوراء یہودی روایت کی اتباع میں

رکھا گیا تھا اور نہ بہ طور نفل و مستحب رکھا گیا تھا بلکہ اہل ایمان نے مکہ مکرمہ کے فرض روزہ کی طرح پہلے سال محرم میں مدینہ میں بھی وہی روزۂ عاشوراء رکھا تھا جس طرح انہوں نے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں سترہ ماہ تک ادا کی تھیں، جس طرح وہ تیرہ برسوں تک مکہ مکرمہ میں ادا کرتے رہے تھے، نماز کی طرح روزہ کی فرضیت اور شرط اور ادائگی سب ہی کچھ یکساں تھی اور مکی حکم کی توسیع مدنی تھی، حدیث مسلم (۱۳۳) (۱۳۴) جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے بیان کرتی ہے کہ عاشوراء کے دن رسول اکرمؐ نے روزہ رکھا اور، ں کے روزے کا حکم دیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ اس دن کی تعظیم تو یہودی و نصاریٰ بھی کرتے ہیں...... یعنی پہلے آپؐ نے روزہ رکھا اور امر و حکم بھی دیا اور بعد میں معلوم ہوا: حين صام رسول الله ﷺ يوم عاشوراء وامر بصيامه قالوا :يا رسول الله !انه يوم تعظمه اليهود والنصارى ...... (نووی ۲/۲۰۵)۔

اب ایک بہت نازک اور اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی سے قبل مدنی مسلمانوں کا روزہ بالخصوص روزۂ عاشوراء کے بارے میں کیا طرز فکر و طرز عمل تھا؟ وہ اسلامی فریضہ روزہ سے واقف اور اس پر عامل تھے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب نہ احادیث و روایات میں اب تک مل سکا ہے اور نہ ہی شارحین حدیث اور دوسرے علمائے کرام نے اس پر کلام کیا ہے، اس سکوت و خاموشی کی وجوہ کی تلاش بھی ایک اہم موضوع تحقیق ہے کہ انہیں پر جواب منحصر ہے، بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''احوال روزہ'' کے ارتقائی سلسلہ اور ان کے تطورات (developments) نہ سمجھنے کے سبب نہ سوال پیدا ہوا اور نہ کلام کیا گیا، یہ ہمارا یعنی بعد کے مسلمانوں اور اہلِ علم کا مسئلہ ہے، معاصر مدنی مسلمانوں کے سامنے حکم واضح تھا اور وہ حکم اسلامی شریعت اسلامی کے مجموعی مطالعہ اور احادیث و سیر کے تقابلی تجزیے سے بہ خوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

مدنی مسلمان ہجرت نبوی سے قبل جب بھی اسلام لائے ہوں وہ اپنے اسلام لانے کے بعد تمام احکام کے عامل تھے، وہ ایمانیات کے علاوہ نماز سے واقف، اس کے احکام پر عامل اور اس کے فرائض و واجبات کو باقاعدہ بجالانے والے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح مکی مسلمان تھے اور یا دوسرے عرب علاقوں کے اہل ایمان تھے یا حبشہ کے مہاجرین و اہل ایمان غیر ملکی تھے، اسی پر قیاس

کیا جاسکتا ہے کہ تمام اہل ایمان بالخصوص اہل مدینہ رسول اکرمؐ اور مکی مسلمانوں کی مانند یوم عاشوراء کا فرض روزہ ادا کرتے تھے، یہ محض قیاس و استنباط نہیں بلکہ مجموعی مطالعۂ اسلام کا واحد اور ناقابل تردید نتیجہ و حقیقت ہے، اسی بنا پر رسول اکرمؐ نے مدنی مسلمانوں سمیت تمام اہل اسلام کو پہلے سال کے محرم میں روزہ عاشوراء بہ طور فرض اسلامی رکھنے کا تازہ اور موکد حکم دیا تھا اور وہ حکم صرف مکی مسلمانوں کے لیے یا مدنی مسلمانوں کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ بعض دوسرے عرب قبایل کو بھی دیا گیا تھا۔

﴿باقی﴾

مقدمہ سیرۃ النبی ﷺ

از:- علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ کو اس کی جن گوناگوں خصوصیات نے منفرد و ممتاز بنایا ہے ان میں اس کے عالمانہ و محققانہ مقدمہ کو بڑا دخل ہے، یہ اب تک سیرۃ النبیؐ کے ساتھ طبع ہوتا تھا تاہم بعض اہل نظر کے توجہ دلانے سے اس کو دارالمصنفین نے علاحدہ شایع کیا ہے کیوں کہ فن سیرت پر اہم اصولی مباحث پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ ایک مستقل تصنیف بھی ہے۔

اس شاہ کار مقدمہ میں سیرت نبوی کی تالیف کی ضرورت و اہمیت اور مقصد تلفیف کے مذہبی، علمی اور کلامی پہلوؤں کا ذکر کرکے قدیم ذخیرہ سیرت کی مختصر تاریخ و کیفیت اور فن سیرت کے بلند معیار و اصول روایت و درایت، کتب سیرت کی خامیاں اور ان کے کتبِ حدیث کا ہم پلہ نہ ہونے کے متعدد وجوہ تفصیل سے قلم بند کیے ہیں، آخر میں یورپین تصنیفات سیرت کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں، ان کے وسایل معلومات اغلاط کے مشترک اسباب اور تعصب اور سوء ظن وغیرہ پر بحث و گفتگو کی ہے۔

قیمت: ۳۰/روپے
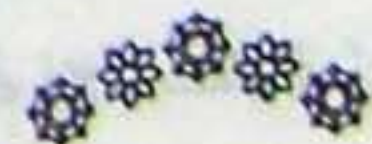
ظہیرالدین محمد بابر

ایک اولوالعزم فاتح اور مدبر حکمراں

از:- جناب محمد شمیم اختر قاسمی صاحب☆

مغل حکمرانوں کا تعلق مغل نسل سے ہے جو مغولیہ (منگولیہ[1]) کے باشندے تھے، ان کی بادشاہت کی بنیاد چنگیز خاں[2] (۱۲۲۷-۱۳۴۶ء) نے ڈالی، تیمور لنگ[3] (۱۳۷۰-۱۴۰۵ء) نے اس حکومت کے ستونوں کو استحکام بخشا اور تعمیر جدید کا کام اسی خاندان کے ایک فرد ظہیرالدین محمد بابر (۱۵۰۵-۱۵۳۰ء) نے کیا، یہاں تک کہ یہ حکومت اورنگ زیب عالم گیر[4] (۱۶۵۹-۱۷۰۷ء) کے زمانہ میں اپنے عروج پر پہنچ گئی، جس کا خاتمہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر[5] کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد ہوا، اس کے بعد ہندوستان پر فرنگیوں کا جھنڈا لہرانے لگا مگر ۱۹۴۷ء میں ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ کوششوں کے نتیجے میں ملک انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہوگیا مگر اکثریت اور اقلیت کے تصور نے اس کے تانے بانے کو درہم برہم کردیا۔

مسلم حکمرانوں نے ہندوستان میں حکومت ہی کو استحکام نہیں بخشا بلکہ اسلامی تہذیب و روایات کو بھی برقرار رکھا، اس کی وجہ سے آج بھی یہ ملک دنیا بھر میں ایک امتیاز رکھتا ہے، جس میں ہندوستان کے پہلے مغل حکمراں ظہیرالدین محمد بابر کا بڑا حصہ ہے، "وہ نہ صرف ایک عدیم المثال سپاہی، عظیم المرتبت فاتح اور اولوالعزم بادشاہ تھا بلکہ ارباب بصیرت نے اس کو ایک بلند پایہ اہل قلم اور قابل قدر شاعر بھی تسلیم کیا ہے، وہ تیمور لنگ کی نسل میں تھا اور اسے ترکے میں میدان کارزار کی پامردی و شجاعت کے علاوہ علم و ثقافت سے شیفتگی و دل چسپی بھی ملی تھی، مگر بعض مورخوں نے اس کے

☆ ریسرچ اسکالر شعبہ سنی دینیات، اے-ایم-یو، علی گڑھ۔

دامن کو داغ دار کرنے کی کوشش کی ہے جسے ہم تعصب و بے انصافی پر ہی محمول کر سکتے ہیں، پیش نظر مضمون میں بابر کے اوصاف و اخلاق، فتوحات اور رعایا پروری کا مطالعہ کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ اس مرد مجاہد نے ہندوستان میں حکومت کو قوت و استحکام عطا کرنے اور اسلامی تہذیب و اقدار کو تحفظ اور فروغ بخشنے میں کیا حصہ لیا ہے۔

بابر کی پیدائش اور تعلیم و تربیت

ظہیرالدین محمد بابر بن عمر شیخ مرزا، بن سلطان محمد مرزا، بن میران شاہ، بن تیمور لنگ ۱۴ر فروری ۱۴۸۳ء/ ۶ر محرم ۸۸۸ھ بہ روز جمعہ قتلق نگار خانم[6] کے بطن سے پیدا ہوا، جو یونس خاں خاقان مغلستان کی بیٹی تھی، ماں کی جانب سے بابر کا تعلق چودھویں پشت میں چنگیز خاں سے مل جاتا ہے[7]، اس طرح بابر کے جسم میں وسط ایشیا کے دو بڑے فاتحین اور قاہروں کا خون دوڑ رہا تھا، جب ظہیرالدین کی پیدائش ہوئی تو خواجہ نصیرالدین بن عبداللہ نے مذکورہ نام رکھا مگر والدین نے بابر تجویز کیا (یہ ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنی شیر یا شیر ببر کے ہیں) اور اسی نام سے اس نے شہرت پائی، بابر بچپن سے ہی لحیم شحیم اور خوب صورت تھا، وہ شجاعت اور بہادری اور سوجھ بوجھ میں بھی فائق تھا، اس کی ابتدائی تعلیم کے متعلق اطمینان بخش تفصیل نہیں ملتی تاہم یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم پر پوری توجہ دی گئی تھی اور اچھے اچھے اساتذہ تعلیم دینے کے لیے مامور کیے گئے تھے[8]۔

بابر کی تخت نشینی

بابر کے والد عمر شیخ مرزا کا انتقال[9] کبوتر خانہ کے گرنے کی وجہ سے ۱۴۹۴ء میں ہوگیا تھا، اس وقت بابر کی عمر ۱۱ سال ۴ ماہ تھی، وہ جون ۱۴۹۴ء/ رمضان ۸۹۹ھ کو اپنے باپ کے تخت فرغانہ کا وارث ہوا جس کی تفصیل بابر نے اپنی تزک میں اس طرح بیان کیا ہے:

> "جب عمر شیخ مرزا کا انتقال ہوگیا تو میں اندر جان کے چار باغ میں تھا، رمضان شریف کی پانچویں تاریخ منگل کے دن مجھے اندر جان یہ خبر پہنچی، میں گھبرا کر سوار ہوا اور جس قدر نوکر میرے پاس تھے ان کو ساتھ لے کر قلعہ کی طرف روانہ ہوا، میں دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ شیرم طغائی میرے گھوڑے کو پکڑ کر عیدگاہ کی طرف چلا، اس کو یہ خیال ہوا کہ وہاں کے لوگ مجھے سلطان احمد مرزا کے حوالے نہ کر دیں لیکن وہاں کے سرداروں نے جب یہ سنا تو میرے پاس آدمی بھیج کر اطمینان دلایا اور میں

> عیدگاہ تک پہنچا ہی تھا کہ مجھ کو واپس لے آئے، میں محل میں آیا، سب سردار میرے پاس حاضر ہوئے، مشورہ ہوا اور قلعہ کو مضبوط بنایا اور جنگ کی تیاری شروع کردی، میرے مقابل جو آئے وہ واپس چلے گئے، ابراہیم سارو میرے والد کی خدمت میں رہ کر امیری کے مرتبہ کو پہنچ گیا تھا، میرا مخالف ہوگیا، وہ میرے مقابلہ پر آیا، میں بھی تیار ہو کر نکلا اور پرانے قلعہ کی دیوار کے پاس پہنچتے ہی نئے قلعہ کو جو ابھی بنا تھا چھین لیا، اس کے بعد آگے بڑھ کر محاصرہ کرلیا، چالیس دن گزر گئے، ابراہیم سارو پریشان ہوگیا اور اس نے میری سرداری تسلیم کرلی، شوال کے مہینہ میں وہ ترکش اور تلوار گلے میں ڈال کر قلعہ سے باہر آگیا اور شہر کو ہمارے سپرد کردیا"[10]۔

سمرقند پر قبضہ

بابر کی ابتدائی زندگی بڑی مشکلات سے گھری ہوئی تھی، اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ تخت فرغانہ کو حاصل کرنے کے لیے اسے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر حکومت ایسی چیز ہے کہ ملک کا ایک حصہ حاصل کر لینے کے بعد دوسرے حصے پر بھی نظر اٹھنے لگتی ہے اور پھر یہ سلسلہ حسب استطاعت و طاقت آگے تک جاری رہتا ہے، چنانچہ بابر کا اگلا قدم سمرقند کو حاصل کرنے کے لیے اٹھا اور ۱۴۹۷ء میں اس نے اس ملک میں بھی اپنی فتح کا جھنڈا نصب کردیا، وہ لکھتا ہے کہ:

> "سمرقند کے تخت پر بیٹھتے ہی میں نے وہاں کے سرداروں کے ساتھ مہربانی شروع کی اور انہیں انعام دیے لیکن اس لڑائی میں لوٹ کا مال ہاتھ نہ لگا، اس لیے میرے ساتھ جو لوگ آئے تھے وہ ایک ایک کر کے چلے گئے، کچھ دن اسی طرح گزر گئے، پھر میرے پاس میری والدہ اور نانی نے اور میرے استاذ میر مولانا قاضی نے ایسے خط لکھے کہ میں مجبور ہوگیا اور رجب کے مہینہ میں (۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء) سمرقند سے اندر جان کے لیے چل پڑا، اسی درمیان اندر جان پر دوسروں کا قبضہ ہوگیا اور سمرقند بھی ہاتھ سے گیا اور اندر جان بھی، لیکن میں پھر بھی ہمت نہ ہارا اور ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء میں پھر جہاں گیر مرزا سے صلح کرلی"[11]۔

تسخیر سمرقند کے وقت بابر کی حالت

بابر بادشاہ نے سمرقند پر کئی بار حملہ کیا اور اسے اپنے قلم رو

میں شامل کیا مگر اپنے ہی قریبی رشتہ داروں کے عناد اور مخالفت کی بنا پر اسے سمرقند سے ہاتھ دھونا پڑا، آخری بار جب اس کو فتح کیا تو اس وقت اس کی کیا حالت ہوگئی تھی اس کا ذکر گل بدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں بڑے کرب اور تاسف کے ساتھ کیا ہے، وہ لکھتی ہیں کہ:

"حضرت بادشاہ (والد محترم) کو بادشاہت و جہاں گیری کے سلسلہ میں جو محنت اٹھانا پڑی اور جن خطرات سے دوچار ہوئے، وہ بہت کم قوموں کے حصہ میں آئے ہوں گے والد بزرگوار نے جس دلیری، مردانگی اور تحمل کا مظاہرہ دشمن سے لڑتے وقت اور خطرات سے ٹکراتے وقت کیا اس کی مثال نہیں ملتی، دو دفعہ اعلاحضرت نے بہ زور شمشیر سمرقند کو فتح کیا، پہلے حملہ کے وقت میرے والد بزرگوار کی عمر ۱۲ سال کی تھی، دوسری بار وہ ۱۹ سال کے تھے، تیسری بار وہ جب سمرقند پر حملہ آور ہوئے تو ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی، چھ مہینے تک انہوں نے سمرقند کے محاصرہ کی شدت برداشت کی، اس محاصرہ کے وقت ان کے چچا سلطان حسین مرزا بیقرا خراسان میں تھے، انہوں نے میرے بابا کو کوئی مدد نہ دی، سلطان محمود خاں کاشغر میں تھے، ان کی طرف سے بھی میرے بابا کو کوئی کمک نہ ملی، چوں کہ کسی طرف سے کوئی مدد ان کو حاصل نہ ہوئی، اس لیے وہ مایوس ہوگئے، اس مصیبت کے وقت شاہی بیگ نے میرے باپ کو پیغام بھیجا کہ اگر تم اپنی بہن خان زادہ بیگم کو میرے ساتھ منسوب کردو تو تمہارے اور میرے مابین صلح ہوسکتی ہے اور رابطہ اتحاد قایم ہوسکتا ہے، مجبوراً میرے باپ نے خان زادہ بیگم کی نسبت خان مذکور سے کردی اور خود قلعہ سے باہر نکل آئے، اس وقت صرف دو سو پیادے میرے باپ کے ساتھ تھے جو کندھوں پر جاپان اوڑھے تھے اور جن کے پاؤں میں کسانوں جیسی چپلیں تھیں اور ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں، اس پریشانی اور اضطراب اور بدحالی میں باپ نے سبحانہ تعالیٰ پر توکل کرکے بدخشاں و کابل کا رخ کیا"۔[۱۲]

شدید مخالفت کے باوجود ۱۴۹۷ء میں بابر نے سمرقند کو حاصل کیا مگر چند مہینوں کے بعد اس کو فرغانہ کے تحت حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا، چنانچہ بابر اپنی سرزمین چھوڑ کر کابل چلا گیا جس کو اس نے اپنی طاقت سے ۱۵۰۴ء میں حاصل کیا، کابل اور اس کے گردونواح پر قابو پانے کے بعد

بابر نے پھر سمرقند کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے لشکروں کو لے کر کوچ کیا، یہاں تک کہ ۱۵۱۱ء میں انہوں نے اس کو حاصل کرلیا مگر دشمنوں نے اس بار بھی اسے یہاں ٹکنے نہیں دیا اور ۱۵۱۲ء میں سمرقند سے نکال دیا، پھر وہ کابل لوٹا اور ہندوستان کی تسخیر کے سلسلے میں غور و فکر کرنے لگا۔

تسخیر ہند کا خواب اور اقدام

بابر کو انیس برس کی عمر ہی سے ہندوستان پر حملہ کرکے اسے اپنی فرماں روائی میں شامل کرنے کی فکر دامن گیر تھی، اس وقت اولاً تو اس کے لشکروں کی تعداد تھوڑی تھی، ثانیاً ابھی اسے ہندوستان کے راستوں کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں تھی، اس لیے اقدام سے باز رہا مگر اس نے ہندوستان کی سرحدوں پر ۱۵۱۹ء سے ۱۵۲۴ء تک کے درمیان چار مرتبہ حملہ کیا[۱۳] اور ہندوستان کے حکمرانوں، راجوں، مہراجوں کی طاقت کا اندازہ لگاتا رہا، اس سلسلے میں گل بدن بیگم لکھتی ہیں کہ:

"ان کو ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوں لیکن اس خواہش کو اس لیے عملی جامہ نہ پہنا سکے کہ ان کے مشیر و وزیر اور بھائی ان سے متفق نہ ہوئے تھے، لیکن جب ان امرا سے بادشاہ بابر کا پنڈ چھٹا جو ان سے اس موضوع پر مباحثہ کرتے رہتے تھے اور اس کی مخالفت کرتے تھے تو بادشاہ نے اپنے دل کی آرزو کو عملی جامہ پہنانے کا اقدام کیا، انہوں نے ۹۲۵ھ میں بجور پر حملہ کیا اور دو تین گھنٹے کی لڑائی کے بعد اس پر قبضہ کرلیا"۔[۱۴]

فتح ہند کے وقت ہندوستان کی سیاسی حالت

بابر جس وقت ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی کوشش کررہا تھا، اس وقت ہندوستان میں مسلم مملکتوں کے دو گروہ تھے اور ان میں ہر گروہ کے لیے ایک بڑی ہندو طاقت دھمکی آمیز حیثیت میں تھی، مسلم مملکتوں کے شمالی گروہ میں سندھ، ملتان، کشمیر، بنگال اور سلطنت دہلی (جو پنجاب سے بہار تک پھیلی ہوئی تھی) اور بندیل کھنڈ شامل تھے، جنوبی گروہ میں گجرات، مالوہ، خاندیش اور دکن کی پانچ ریاستیں، بیجاپور، برار، بیدر، گول کنڈہ اور احمد نگر شامل تھیں، راجپوتانہ، اڑیسہ اور گنڈوانہ کی آزاد اور خود مختار ریاستیں تھیں، مغربی ساحل پر پرتگیزیوں نے اپنا اقتدار قایم کرلیا تھا، جنوب کی سلطنت وجے نگر اپنے حکمراں کرشنا دیورائے (۱۵۳۰-۱۵۰۹ء) کی وجہ سے عروج پر تھی، "ظہیر الدین بابر اور اس کا عہد" کا مصنف رقم طراز ہے:

"جب شہنشاہ بابر فاتح ہندوستان کی حیثیت سے دہلی کے تخت پر بیٹھا، اس وقت ہندوستان عجیب حالات میں گھرا ہوا تھا اور یہ حالات بعد والے زمانہ سے یکسر مختلف تھے، اس وقت دہلی کی حکومت کے علاوہ جو کشمیر کے نمک کے پہاڑی سلسلہ سے لے کر بہار تک پھیلی ہوئی تھی اور دوسری طرف گوالیار سے لے کر ہمالیہ تک تھی، ہندوستان میں ایک راجہ اور تین بادشاہ اور تھے اور یہ بڑے طاقت ور حکمراں تھے، جون پور کی حکومت جو دہلی کے مشرقی حصے سے دریائے گنگا کے دوسرے کنارے پر دور تک پھیلی ہوئی تھی، اس حکومت کو لودھی خاندان نے کچھ عرصہ کے لیے اپنے زیر اقتدار کرلیا تھا لیکن اب وہاں بغاوت ہوچکی تھی اور اس کا اپنا ایک علاحدہ حکمراں تھا، بنگال، گجرات اور مالوہ تین الگ الگ حکومتیں تھیں اور ان پر نصرت شاہ، سکندر شاہ اور سلطان محمود کی حکومت تھی، اس میں آخری حکومت مالوہ کچھ عرصہ پہلے سے روبہ زوال تھی، راجہ رانا سانگا جو راج پوتوں کا ایک بہادر سردار اور چتوڑ کا بادشاہ تھا، اس نے مالوہ کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھایا اور اس کے بہت سے علاقے اور صوبوں کی حکومت چتوڑ میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا، اس میں رنتھمبور، چندیری اور دوسرے بڑے صوبے شامل تھے، یہ راج پوت شہزادہ اپنی طاقت کو تیزی سے بڑھا رہا تھا، دریائے نربدا کے جنوب میں جو ریاستیں تھیں وہ دہلی سے علاحدہ اور خود مختار تھیں"۔ (ص: ۴۸۰-۴۷۹)

افراتفری کا اثر سماجی سطح پر بابر کے ہندوستان میں وارد ہونے تک ہندوستان کی سیاسی حالت ناگفتہ بہ رہی جس کا اثر ہندوستانی سماج و معاشرت پر بھی پڑا، یہ جنگ و جدال صرف طبقۂ امرا تک محدود نہ تھا بلکہ یہاں کی رعایا بھی چاہے ہندو ہوں یا مسلمان اس کی زد میں تھے، ملک کے کسی بھی خطے میں امن و امان نہ تھا، سلاطین و امرا کی طرح ملک کے عام باشندے بھی آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے ہندوستانی رعایا مفلوک الحالی کی زندگی بسر کررہی تھی اور لشکروں میں بھرتی ہوجانے اور چوکی داری وغیرہ کا کام کرنے کے لیے مجبور تھی، علما و فضلا، ادبا اور شعرا، سلاطین و امرا سے متوسل ہوجاتے تاکہ ان کی مدح سرائی کرکے روزینہ حاصل کریں، ایسے پرآشوب دور میں بھی صوفیائے کرام اپنے استغنا اور بے نیازی کی وجہ سے درباروں سے کنارہ کش رہ کر مجاہدہ

و ریاضت میں مصروف رہتے تھے اور پند و نصائح اور وعظ و تبلیغ کے ذریعہ عام مسلمانوں کو قناعت اور رزق حلال کے حصول کی تلقین کرتے اور اتحاد و اتفاق کا درس دیتے تھے، جب کہ امرا عیش و عشرت کی زندگی میں منہمک رہ کر اپنی رعایا سے غافل تھے[۱۵] مسلمان عوام کا یہ حال تھا کہ:

"فسق و فجور میں ترقی تھی مگر فسق و فجور پر اصرار اور معاصی و محرمات کے اظہار و اعلان کا رواج نہیں ہوا تھا، اہل دنیا کی وقعت اور اہل حکومت کا رعب ضرور تھا مگر اہل دین کی توقیر اور اہل علم کا اعزاز بھی قایم تھا اور دین کے ساتھ تمسخر و استہزا کا دروازہ نہیں کھلا تھا، محکومی و غلامی کے لیے تیاری شروع ہوگئی تھی مگر اسلاف کی مردانگی و سپہ گری کا بچا کھچا سرمایہ باقی تھا، شجاعت و دلیری، وفاداری، وضع داری، پختگی، استقامت، عالی ہمتی، فراخ حوصلگی، جفاکشی و مستعدی جوہر شناسی، ذہانت و طباعی سے ابھی ہندوستانی مسلمانوں کا دامن خالی نہیں ہوا تھا"[۱۶]

ادھر ہندو بھی متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور اونچ طبقے کے لوگ نچلے طبقے کے لوگوں کو ذلیل و خوار اور کم تر شمار کرتے تھے، اونچی ذات کے لوگوں نے مذہب کو اپنے لیے خاص کررکھا تھا، رسوم کی ادائیگی کا حق صرف ان ہی کو حاصل تھا، یہی لوگ ہندوؤں کی چاروں مقدس کتابوں اور رسم و رواج کی تشریح و توضیح کرتے تھے، اگر پست ذات کے لوگ ایسا کرتے تو انہیں سخت سزائیں دی جاتیں، بہ یک وقت ان کے کئی کئی بیویاں ہوتی تھیں، بیوہ عورتیں ستی ہوجاتی تھیں، مزدور اور کاشت کار کھیتی باڑی اور درخت لگانے اور پھلوں کی نگہداشت پر مامور تھے مگر انہیں اتنی قلیل اجرت ملتی تھی جو ان کے گزر بسر کے لیے بالکل ناکافی ہوتی۔

ایک تجربہ کار قاید کی ضرورت ایسے نازک وقت میں ایک ایسے تجربہ کار عسکری قاید اور منظم سپاہ کی ضرورت تھی جو نئی جنگی طاقت سے معمور تو ہو لیکن مخمور نہ ہو، اس کے اندر سپہ گری کے جوہر اور شجاعت و بہادری کے ماسوا ایمانی غیرت و دینی حمیت بھی ہو، نیز وہ ان ذیلی و ضمنی اختلافات، رقابتوں اور اس دشمنی اور کینہ سے محفوظ ہو جو دہلی کے ایوان سلطنت اور ملک کے اہل سیاست کو گھن کی طرح کھا رہے تھے اور جن کی موجودگی میں کسی ایسے بلند تر مقصد کی تکمیل کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی جس میں بہ جائے کسی نسلی عنصر، مذہبی گروہ یا ذاتی فتح مندی کے حصول کے ملت کا فائدہ

اسلام کی تقویت اور ملک کی حفاظت مقصود و پیش نظر ہو، اس کے لیے ایک تازہ دم بیرونی فوجی قاید کی ضرورت تھی جو اس ملک کے لیے مطلقاً اجنبی اور نو وارد نہ ہو، وہ اس ملک کے نشیب و فراز، باشندگان ملک کی راہ و رسم اور یہاں کے حریف اور نبرد آزما گروہوں کے مزاج اور کمزوریوں سے بھی واقف ہو، یہ تمام اوصاف ظہیر الدین بابر کے اندر بہ درجۂ اتم موجود تھے، جب وہ یہاں آیا تو اسے شدید جنگ اور خطرات سے دوچار ہونا پڑا مگر وہ ان مشکلات و مصایب کی پروا کیے بغیر اپنی عالی ہمتی کی بہ دولت ہندوستان میں ایک ایسی حکومت کی تعمیر و تشکیل میں کامیاب ہوا جو بعد کے حکمرانوں کے لیے ایک مشعلِ راہ بنی اور ہندوستانی رعایا کو سکون و آرام سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملا، اس کی وجہ سے ہندوستان کی معاشی اور سماجی و مذہبی حالت بھی بہت بہتر ہوئی۔

بابر کے خواب کی تعبیر

بابر کئی بار ہندوستان کی سرحدوں پر حملہ کر کے یہاں اپنی حکومت کا خواب دیکھ رہا تھا جس میں وہ اب تک کامیاب نہیں ہوسکا تھا کیوں کہ اس کی فوجی حالت زیادہ مستحکم نہ تھی مگر اس کی انصاف پسندی، دین داری اور رعایا پروری کی پوری کہانی ہندوستانی عوام کے سامنے موجود تھی، انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ بابر ایک بہادر اور دلیر ہے، لہذا ان لوگوں نے خوب سوچ سمجھ کر اسے دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور اس کا ساتھ دینے کا یقین دلایا[۱۷] ان لوگوں کا خیال تھا کہ جس طرح بابر کے دادا نے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر مکمل فتح حاصل کر لی تھی مگر اس کی فضا ناموافق پاکر مالِ غنیمت لے کر کابل کے راستے سمرقند لوٹ گیا[۱۸] اسی طرح بابر بھی فتوحات کے بعد واپس چلا جائے گا۔

بہر حال بابر کو جب بلاوے کا خط ملا تو اس نے موقع غنیمت سمجھ کر فوری اقدام کیا، نومبر ۱۵۲۵ء میں اپنا پانچواں اور آخری حملہ ہندوستان پر کیا جس میں وہ فتح سے ہم کنار ہوا اور برسوں سے جو خواب دیکھ رہا تھا اس کی تعبیر سامنے آئی، جب یہاں کے راجے مہاراجے اور حکمرانوں کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ بابر یہاں سے رخصت ہونے کے لیے نہیں آیا ہے تو ان لوگوں نے مل کر بابر کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا[۱۹] بابر نے پہلے ان لوگوں کو مطیع و منقاد بنانے کی کوشش کی اور اکثر کو گرفتار کیا مگر بعد میں ان کے املاک و اختیارات ضبط کر کے انہیں رہا کر دیا۔

فتح دہلی

پنجاب اور اس کے گرد و نواح کے حالات پر قابو پانے کے بعد بابر نے دہلی کا رخ کیا

جو ہندوستان کا قلب تھا، جہاں سے پورے ملک کی تسخیر کی جاسکتی تھی، جب ابراہیم خاں لودھی کو اس کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ ایک لاکھ سواروں پر مشتمل مسلح اور تجربہ کار لشکر جرار لے کر جنگ کے لیے نکلا، بابر کی فوج اس کے مقابلے میں قریباً بارہ ہزار تھی مگر ابراہیم فنِ سپہ گری اور لشکروں کو میدان جنگ میں منظم کرنے کے فن سے ناواقف تھا اور بابر فنون حرب اور میدانِ جنگ میں لشکروں کو منظم کرنے کا بڑا تجربہ رکھتا تھا، چنانچہ دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ پانی پت کے میدان میں ۲۱ راپریل ۱۵۲۶ء کی صبح کو ہوئی، بابر نے اپنے کہنہ مشق قاید استاذ علی اور سپہ سالار مصطفےٰ کو دائیں بائیں آگے پیچھے تمام مورچوں پر مامور کیا، دونوں نے دشمن کی فوج پر جم کر گولیاں برسائیں، گھمسان کا رن پڑا، یہاں تک کہ لڑائی چند گھنٹے بعد دن کے نصف حصے میں ختم ہوگئی، ابراہیم لودھی اپنے پندرہ آدمیوں کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

بابر کو اس جنگ میں بہت سا مال اور اسلحہ ملا اور وہ گھوڑے اور ہاتھی بھی اس کے ہاتھ لگے جن کو ابراہیم کی فوج جنگ میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی، اس کے بعد بابر نے مہدی خواجہ محمد سلطان اور عادل سلطان کو حکم دیا کہ جلدی سے جاکر دہلی پر قبضہ کریں اور خزانوں کی حفاظت کریں اور خود تین دن بعد دہلی پہنچ کر تخت نشیں ہوا اور جمعہ کے خطبہ میں شیخ زین الدین صدر نے اس کے نام کا خطبہ پڑھا، بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو حکم دیا کہ وہ آگرہ کی طرف روانہ ہو کر وہاں کے حالات پر قابو پائے اور قلعہ پر اقتدار حاصل کرے، آگرہ میں ہمایوں کو راجہ بکرماجیت کی اولاد نے ایک بڑا خزانہ نذر کیا جس میں مشہور اور قیمتی "کوہ نور" ہیرا بھی تھا، مغلیہ دربار سے یہ ہیرا رنجیت سنگھ کو ملا، وہ لاہور کا راجہ تھا، وہاں سے انگریزوں کے ہاتھ آیا اور اب یہ ہیرا انگلستان کی ملکہ کے پاس ہے۔[۲۰]

فتح دہلی کا حال بابر کی زبانی

دہلی اور آگرہ کو تسخیر کر لینے کے بعد بابر نے دہلی کے بجائے آگرہ ہی کو دارالخلافہ بنایا، اپنی اس کامیابی کا حال خود اس طرح سپرد قلم کیا ہے:

> "رسالت پناہ کے بعد سے اس وقت تک تین فرماں روائے اسلام ہندوستان آئے اور اس ملک پر قبضہ کیا، اول سلطان محمود غزنوی، عرصہ تک اس بادشاہ کی اولاد ہندوستان کی حکومت کرتی رہی، دوسرے سلطان شہاب الدین غوری جس کے لے پالک بیٹوں نے بڑے جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی اور تیسرا میں ..... لیکن میرا حال

دونوں پیش رو حکمرانوں سے بالکل مختلف ہے، سلطان محمود نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت وہ ماوراء النہر، خوارزم اور خراسان کا بھی حاکم تھا اور غزنوی فوج کی تعداد بھی ایک لاکھ سے کم نہ تھی، اس وقت ہندوستان کی حالت بھی ٹھیک نہ تھی، یہاں کوئی عظیم الشان بادشاہ نہ تھا، جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے راجے حکومت کرتے تھے، اگر چہ سلطان شہاب الدین غوری خراسان کا بادشاہ نہ تھا تاہم اس کا بھائی بادشاہ تھا اور سلطان غوری ایک لاکھ بیس ہزار سوار لے کر ہندوستان آیا تھا، غزنوی سلطان کی طرح غوری کے وقت میں بھی ہندوستان میں طوائف الملوکی تھی لیکن میرا حال یہ ہے کہ جب میں پہلی بار ہندوستان آیا تو ڈیڑھ ہزار سوار میرے ہم رکاب تھے، بدخشاں، کابل اور قندھار کی حکومت میری تھی لیکن ان شہروں سے نصف خراج بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا، مملکت کے بعض حصے ایسے تھے کہ دشمن کے قریب ہونے کی وجہ سے مدد کے محتاج تھے، ہندوستان میں بھیرہ سے بہار تک افغانوں کا تسلط تھا، ہند کی طاقت کو دیکھتے ہوئے میرے پاس پانچ لاکھ فوج ہونی چاہیے تھی، ابراہیم کا لشکر ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھا، اس کے علاوہ ایک ہزار جنگی ہاتھی بھی اس کی فوج میں تھے، اس سے زیادہ یہ بات تھی کہ ازبک جیسے زبردست حریف کو اپنے پیچھے چھوڑ کر لودھی جیسے خوں خوار دشمن سے میں نے ٹکر لی لیکن خدا کا بھروسہ اور فضل کام آیا، ان تمام مشکلات کے ہوتے بھی مجھے کامیابی ہوئی اور ہندوستان میرے قبضہ میں آگیا، اس کو صرف اپنی کوشش اور جد و جہد کا نتیجہ نہیں سمجھتا بلکہ یہ فتح محض خدا کی عنایت اور کرم کی وجہ سے مجھے نصیب ہوئی، یہ میرا ایمان ہے''۔[۲۱]

بابر سے ہندوستانی عوام کی بدظنی کی وجہ

گو بابر دہلی جیسی عظیم حکومت کا مالک بن گیا تھا، ابھی اس کے قدم ہندوستان میں پوری طرح جمے نہیں تھے اور متعدد مشکلات اس کے سامنے تھیں، ہندوستانی عوام بابر سے نفرت کرتی تھی، دارالخلافہ آگرہ کے کسان اور ہندوستانی فوج کے لوگ مغلوں کو دیکھ کر بھاگ جاتے تھے اور کسی طرح ان کا تعاون کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے، راج پوت اور افغان سے بھی خطرہ لاحق تھا، کیوں کہ یہ لوگ اپنے عزم و ارادہ میں بڑے پختہ ہوتے ہیں،

انہوں نے اس کے اور اس کی فوج کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلا رکھی تھیں اور انہیں وحشی کہہ کر پکارتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ لوگ ہندوستانی عوام کو لوٹنے اور تباہ کرنے، عورتوں کی عصمت برباد کرنے اور ہمارے مذہبی معابد کو منہدم اور مسمار کرنے کے لیے آئے ہیں، مگر جب بعد میں ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ لوٹ مار کے لیے نہیں بلکہ ایک اچھی حکومت دینے اور ملک کو قوت و استحکام بخشنے کے لیے آئے ہیں تو ان کے تعلقات بابر سے اچھے ہو گئے تاہم ان کا اعتماد بحال ہونے میں عرصہ لگا۔

جنگ کنہوایاں کی فتح

افواہوں کی وجہ سے خود بابر اور اس کی فوج سخت الجھن اور تشویش میں مبتلا تھی اور ہندوستانی رعایا کا غم و غصہ اور نفرت دیکھ کر اس قدر دل برداشتہ ہو گئی تھی کہ ہندوستان چھوڑ کر کابل لوٹ جانا چاہتی تھی، دوسری طرف راج پوت اور افغان فوجیں بھی بابر سے لڑنے پر آمادہ تھیں، دوسرے رانا سانگا جو چتوڑ کا ایک بڑا کامیاب حکمراں اور سارے راج پوتوں میں اپنی شجاعت، بہادری اور دانش مندی کے لیے مشہور ہی نہیں تختِ دہلی کا دعوے دار بھی تھا، اس نے بھی بابر سے جنگ کرنے کے لیے ایک بڑی فوج اکٹھا کر لی تھی، اس بڑی طاقت سے بھی بابر کی فوج بہت خوف زدہ ہوئی، مگر ابھی تک اس نے نہ خود ہمت ہاری تھی اور نہ جانے ہی کا ارادہ کیا تھا، غرض بابر اور ہندوستانی فوج کے درمیان ۱۵۲۷ء میں کنہوایاں میں بڑی معرکہ خیز جنگ ہوئی، یہ جگہ فتح پور سیکری سے دس میل کی مسافت پر واقع ہے، اس جنگ میں رانا سانگا کے ساتھ ایک سو بیس راج پوت امیر، تقریباً اسی ہزار سوار اور پانچ ہاتھیوں کا ایک لشکر جرار تھا، اس کے علاوہ ابراہیم لودھی کا بھائی محمود لودھی اور قاید حسن خاں میواتی بھی رانا سانگا کی مدد کے لیے آن پہنچا۔

حسن خاں میواتی کی غداری

حسن خاں میواتی کو بابر اپنا دوست سمجھ کر اس سے مستقل خط و کتابت کرتا تھا لیکن اس کے دشمنوں کی صف میں جا ملنے سے بابر کو کافی دھکا پہنچا، ''ظہیرالدین بابر اور ان کا عہد'' کے مصنف تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''بادشاہ بابر کو حسن خاں کی شمولیت سے سخت تکلیف ہوئی، خان ایک ذی اثر اور بہادر سردار تھا، پانی پت کی مشہور جنگ میں اس کا لڑکا طاہر خاں بابر کے خلاف لڑتے ہوئے گرفتار ہو گیا تھا اور اس وقت سے حسن خاں بابر کو ہمیشہ دوستانہ خطوط بھیجتا

رہا تھا اور اپنی محبت، وفاداری کا اقرار کرتا رہا تھا، اس نے اپنے بیٹے کی رہائی کی بابر سے سفارش بھی کی تھی، بابر نے سوچا کہ اگر وہ حسن خاں کے لڑکے کو آزاد کردے تو اس کا باپ اس احسان کے بدلہ میں شاید اس سے مل جائے، چنانچہ انہوں نے طاہر خاں کو خلعت دے کر اس کے باپ کے پاس باعزت واحترام واپس کردیا، جاتے وقت طاہر خاں نے بھی وعدہ کیا لیکن جیسے ہی حسن خاں کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا بابر کے چنگل سے نکل گیا ہے اور اس سے ملنے آرہا ہے، وہ اپنے بیٹے سے ملاقات کیے بغیر الور سے جو اس کا پایہ تخت تھا روانہ ہوا اور رانا کی فوج میں شامل ہوگیا''۔[۲۲]

بابر کی فوج پر اس کا اثر

اس غداری سے بابر بہت متاثر ہوا اور دشمن کی فوجوں کا جم غفیر دیکھ کر بابر کے لشکروں پر بھی بڑا خوف طاری تھا، اس کی فوج کے لوگوں نے بابر کو جنگ کرنے سے منع کیا اور اپنے ملک واپس ہوجانے کا مشورہ دیا، شریف خاں منجم نے بھی اپنے زایچہ کی مدد سے بابر کے لیے جنگ میں ناکامی کی پیش گوئی کی، یہاں تک کہ خواجہ کلاں جیسا بہادر افسر بھی وطن لوٹ جانے کے لیے مضطرب تھا۔[۲۳]

خواجہ کلاں میر صدر الدین کی خدمات

خواجہ کلاں میر صدر الدین کے لڑکے تھے جو بابر کے والد کا ایک بڑا اچھا مشیر تھا اور مذہبی اور سیاسی امور میں ہمیشہ ان کا ساتھ دیتا تھا، بابر تخت فرغانہ پر بیٹھا تب سے اب تک یہ خاندان اپنے اس نوعمر شہزادے کا ہر حال میں ساتھ دیتا اور ہمیشہ وفادار رہا، یہاں تک کہ خواجہ کلاں کے چھ بھائی بابر کی معیت میں میدان جنگ میں قتل ہوئے اور صرف خواجہ کلاں باقی بچا، یہ بڑا عالم اور بڑا بہادر انسان اور بابر کا اعلا سپہ سالار اور دانا مشیر تھا، بابر کی ہندوستانی فتوحات میں اس کی نمایاں خدمات تھیں، بابر اس سے بہت مانوس بلکہ اس کا دوست تھا۔

بابر کی تقریر

بابر نے اپنی فوج کی یہ حالت دیکھی تو سخت متحیر اور پریشان ہوا، اور نہایت جوش وجذبہ میں سرشار ہوکر فوج سے یوں مخاطب ہوا:

''تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم دشمنوں سے پوری طاقت ودل جمعی کے ساتھ جنگ کرو اور میدان جنگ میں اپنی اہلیت ثابت کرو، یہاں تک کہ تم مرجاؤ یا اس معرکہ میں کامیابی سے ہم کنار ہوجاؤ، میدان چھوڑ دینا بغیر جنگ کے اتنی بڑی ذلت

ہے کہ ہم جیسے دلیر اور بہادر لوگ اسے برداشت نہیں کرسکتے، ہم بڑے عظیم لوگ ہیں اور ہمارے دشمن تو بس گنوار ہیں، بار بار ایسا ہوا ہے کہ بہت مختصر سی جماعت بڑی بڑی جماعتوں پر غالب ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔[۲۴]

بابر کی اصل خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے لشکروں سے ناراض نہیں ہوتا تھا اور ہر مشکل گھڑی میں فوجوں کے ساتھ ہوتا اور عمدہ نصیحتوں اور دل چسپ باتوں سے اس کے جوش وجذبہ کو ابھارتا، ان کی ہمت وحوصلہ کو بڑھاتا، اس موقع پر بھی اس نے ایسا ہی کیا اور ان کو جنگ کے لیے راضی کرلیا۔

نئے جوش وجذبہ کے ساتھ

لشکر بابر کی یہ تقریر سن کر بہت متاثر ہوا اور اس کی غیرت وخودداری کو تازیانہ لگا، پورے لشکر نے مل کر وہی طے کیا جو بابر چاہتا تھا کہ ہم میدان جنگ سے منہ نہ موڑیں گے، مرگئے تو شہید اور کامیاب ہوئے تو غازی کہلائیں گے، چنانچہ سب نے بہ یک آواز ہوکر نعرہ جنگ بلند کیا،[۲۵] مزید اطمینان کے لیے امرا سے باقاعدہ حلف لیا گیا، بابر کی تقریر سے خواجہ کلاں کا بھی دل پگھل گیا، اب اس نے کابل لوٹنے کے بجائے بابر کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا، مگر بابر نے کسی مصلحت کے پیش نظر خواجہ کلاں کو غزنی اور گردونواح کا گورنر مقرر کرکے اور اعزاز وانعام سے نواز کر غزنی روانہ کردیا، خود بابر نے جسے شراب کے بغیر چین نہیں آتا تھا حالات کے اقتضا کے تحت اسے ترک کردیا،[۲۶] ریش تراشی سے توبہ کرلی، مکروہات سے بھی اجتناب کرنے لگا اور خدائے عزوجل کی بارگاہ میں دعا کر کے میدان جنگ میں آگے بڑھا۔[۲۷]

جنگ کنہوایاں میں کامیابی

بابر نے اپنے لشکروں کو جس طرح پانی پت کے میدان میں ترتیب دیا تھا ٹھیک اسی طرح یہاں بھی اپنی فوج کو منظم کیا، بڑے بڑے سپہ سالاروں کو دائیں بائیں، آگے پیچھے تمام مورچوں پر متعین کردیا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ توپوں اور گولیوں کے ساتھ آگے بڑھیں اور پورے جوش وجذبہ اور طاقت کے ساتھ دشمنوں پر گولیوں کی بارش کریں، یہ لڑائی صبح سے شام تک جاری رہی، راج پوتوں نے بھی پوری بہادری کے ساتھ جنگ شروع کی لیکن بعد میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور میدان چھوڑ کر فرار ہونے لگے، بھاگنے والوں میں صدر مسلم سلحدی بھی تھا جو اپنے حمایتیوں کو لے کر منقطع ہوگیا اور بابر کے لشکروں میں شامل ہوگیا، بابر کی فوج نے چاروں طرف سے رانا سانگا کی فوج کا محاصرہ کرلیا، وہ لوگ مارے خوف کے اپنے لیے

امن کی جگہ تلاش کرنے لگے تھے مگر کوئی جگہ امن کی نہ ملی، بڑی تعداد میں یعنی ایک لاکھ کے قریب دشمن کی فوج قتل ہوئی، رائے راول، چندر بھان چوہان، مانک چند چوہان، کرم سنگھ راج پوت اور قاید حسن خاں میواتی وغیرہ عالی جاہ اور اولوالمرتبت امیر میدان جنگ میں موت کے گھاٹ اتارے گئے، جب کہ رانا سانگا میدان سے فرار ہوگیا اور دو سال بعد ۱۵۲۹ء میں شکستہ دل ہوکر مرگیا۔[۲۸]

جنگ کنھوایاں کا اثر عوام پر

یہ جنگ پانی پت کی جنگ سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ اس کے بعد بابر کو اپنی سلطنت کے حدود کو راج پوتانہ تک وسیع کرنے کا موقع ملا جہاں راج پوتوں کا بہت بڑا قلعہ تھا، ان لوگوں نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ کوئی اسے فتح کرلے گا اور ان کو ان کے قلعہ سے نکال کر پہاڑوں کی گھائی میں بھاگنے پر مجبور کردے گا، جب راج پوتوں کا رعب ودبدبہ ختم ہوجانے کے بعد دوسرے دشمنوں اور افغانیوں کے لیے بھی یہ ممکن نہ رہا کہ وہ بابر اور اس کے حمایتیوں سے کھل کر بغاوت کریں، جب کہ اس سے پہلے اور پانی پت کی فتح کے بعد بھی افغان قبایل کے رہنماؤں نے خودمختار سرداروں کی حیثیت اختیار کرلی تھی اور مناسب قلعوں میں خود کو محفوظ ومحصور کرلیا تھا، لیکن اس جنگ کے بعد یہ سب ٹھنڈے پڑگئے، قاسم سنبھلی سنبھل میں، نظام خاں بیانہ میں، حسن خاں میواتی میوات میں، محمد زیتون دھول پور میں، تاتارخاں سارنگ خانی گوالیار میں، حسن خاں لوہانی رابیری میں، قطب خاں اٹاوہ میں اور عالم خاں کالپی میں، برابر بابر کو دھمکی دیتے اور لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔[۲۹]

جنگ کنھوایاں کے بعد بابر نے جو لڑائیاں کیں وہ یا تو اپنی قوت وحکومت کی توسیع کے لیے یا باغیوں کو زیر کرنے کے لیے یا ملک کی تنظیم کے لیے کیں۔

جنگی کارروائی کا التوا

اس جنگ پر قابو پانے اور دشمنوں کو پسپا کرنے کے بعد بابر نے چاہا کہ اپنی فوج کو کسی قدر آرام کرنے کا موقع دے اور ان افسروں کو چھٹی دی کہ کابل ہو آئیں جو جنگ سے پہلے وہاں لوٹ جانے کی رٹ لگائے ہوئے تھے، ان کو رخصت دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کابل افواج سے خالی ہوگیا تھا جس سے بابر کو تشویش رہی ہوگی کہ اس کی مرکزیت اگر ختم ہوگئی اور خدانخواستہ کسی مجبوری سے اسے ہندوستان چھوڑنا پڑا تو وہ اس مرکز سے مستقبل میں اپنی کارروائی کرسکے گا، علاوہ ازیں بابر کو سیر وتفریح کا بہت شوق تھا لہذا وہ بھی کول اور سنبھل

کی طرف سیر وتفریح کے لیے نکل گیا۔[۳۰]

چندیری میں میدانی رائے سے مقابلہ

سیر وتفریح سے واپس ہوا تو خبر ملی کہ راج پوت میدانی رائے کی قیادت میں اس سے لڑنے کے لیے آرہے ہیں مگر اس خبر سے وہ کچھ بھی نہ گھبرایا اور اپنی بقیہ فوج کو لے کر چندیری کے میدان میں پہنچ گیا، جنوری ۱۵۲۸ء کو میدانی رائے سے جنگ ہوئی، مگر بعد میں وہ اپنی فوج کو لے کر قلعہ بند ہوگیا، بابر کی فوجوں نے محاصرہ کرکے شدید جنگ کی، دشمن بڑی تعداد میں مارے گئے اور یہ دیکھ کر کہ بابر کی فوج انہیں ہلاک کرڈالے گی تو انہوں نے اپنی ہی تلواروں سے خود اپنی گردنیں کاٹ لیں، جو لوگ بابر سے فریاد کے خواستگار ہوئے اور قلعہ سے باہر نکل آئے، انہیں امان دی گئی، میدانی رائے کا بھی برا حشر ہوا، اس کے بعد بابر نے یہ قلعہ احمد شاہ بن ناصر الدین کے سپرد کردیا۔

چوں کہ میدانی رائے کا برتاؤ اپنی سلطنت کے مسلمانوں سے اچھا نہ تھا، ان کی حکومت میں نہ انہیں مذہبی آزادی میسر تھی اور نہ شعایر اسلام پر عمل کرنے کی اجازت تھی، چنانچہ شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ:

> ”بابر نے جب یہ علاقہ فتح کرکے چندیری، سارنگپور اور رنتھمبور کی مسجدیں اور خانقاہیں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ رائے میں نے جا مالوہ کا بااختیار وزیر تھا، انہیں رانا سانگا اور میدانی رائے کے حکم سے حیوانات کا مسکن بناکر فضلۂ گاؤ سے لیپ رکھا ہے، شیخ زین الدین صدر کی کوشش سے یہ کثافت اور غلاظت دور ہوئی اور موذن اور جاروب کش مقرر ہوکر پھر ان مسجدوں میں آواز بلند ہونی شروع ہوئی“۔[۳۱]

(باقی)

حوالے

۱ موگل یا منگول لفظ مغل سے بنا ہے، نون غنہ اور گاف عربی میں غین سے تبدیل ہوگیا ہے جس کے معنی جواں مرد کے بیان کیے گئے ہیں، مورخین منگول اور مغل میں فرق قرار دیتے ہیں وہ منگول کا اطلاق صرف ان صحرانورد غیر مسلم خانہ بدوش لوگوں پر کرتے ہیں جن کا سردار چنگیز خاں تھا اور مغل کا لفظ صرف ان مسلمان ترکوں کے لیے وقف کر دیا ہے جنہیں سلاطین تیموریہ کہا جاتا ہے، اس لیے ہندوستان میں مغل وہی ہیں جو یہاں کے حکمراں مغلیہ خانوادے

سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا تعلق پٹھانوں سے نہیں ہے، امیر تیمور کا شاہی خاندان جس نے ہندوستان میں حکومت کی نسلاً ترک تھا، وہ لوگ مغل اس لیے کہے گئے کہ امیر تیمور کا یہ قدیم ترکی قبیلہ دراصل منگول سے وابستہ تھا، اس لیے مغل کے قدیم نسل و وطن کی ساری داستان وہی ہے جو منگول کے نام سے تاریخوں میں ملتی ہے (عہد اسلامی کا ہندوستان، ریاست علی ندوی، ص۲۱۹، ادارۃ المصنفین، پٹنہ ۱۹۵۰ء) ۲ ترکوں کا مورث اعلا "یافث اغلان" تھا، اس کی نسل میں چند پشتوں بعد ایک مشہور بادشاہ "انجہ خاں ثانی" کا نام ملتا ہے جس کے دو بیٹے تاتار خاں اور مغول خاں تھے، انہی کی اولاد تاتاری اور مغل کہلائی "قراخاں" "مغول خاں کی اولاد میں سے ہے، اس بادشاہ سے مغل دو شاخوں میں بٹ گئے، ایک سلسلہ چنگیز خاں اور دوسرا "آغزیہ مغل" کہلایا، مشہور توحید پرست بادشاہ "اغزہ" اسی قراخاں کی اولاد میں تھا "اغزہ" کی نسل میں کئی پشتوں بعد ایک بادشاہ سوغوچمپین ہے، اس کا لڑکا تموچیں ہی وہ نامور فاتح ہے جسے چنگیز خاں کے نام سے دنیا یاد کرتی ہے، جس نے ایشیا کے ایک بڑے حصے کو اپنی خوں ریز یلغار سے پامال کردیا (منتخب اللباب اردو، ہاشم علی خاں بہ مشہور خافی خاں نظام الملک مترجم محمود احمد فاروقی، ص۳۹، نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۳ء) ۳ امیر تیمور کا سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے "قاچولی بہادر" کی اولاد میں قراچار نویان سے ملتا ہے جو چغتا خاں (بن چنگیز خاں) کا اتالیق تھا، وہ ۷/اور ۸/اپریل ۱۳۳۴ء کی شب میں پیدا ہوا اور جب اس کی عمر ۲۵/سال کی ہوئی تو اس کے باپ کا انتقال ہوگیا، ۳۵/سال کی عمر میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا، اس کا انتقال ۱۵/یا ۱۶/فروری ۱۴۰۵ء میں ہوا، اس کی فتوحات میں ماوراءالنہر، خوارزم، ترکستان، عراقین، خراسان، آذربائیجان، فارس، ماژندران، خوزستان، مصر، شام، بلاد روم، ہندوستان وغیرہ کے علاقے شامل ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جامع تاریخ ہند، محمد حبیب کے اے نظامی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۰۱ء) ۴ اورنگ زیب عالم گیر شاہ جہاں کا تیسرا بیٹا تھا، ان کی پیدائش ۲۴/اکتوبر ۱۶۱۸ء میں ہوئی اور انتقال ۱۱۱۸ھ میں ہوا، وہ اس تخت برّاعظم میں اشوک کے بعد سب سے بڑا فرماں روا ہے، اس کی حکومت غزنی سے چاٹگام تک اور کشمیر سے کرناٹک تک وسیع تھی، قدیم زمانہ سے انگریزوں کے عروج تک ہندوستان میں اتنی طویل و عریض حکومت بھی قایم نہ ہوئی تھی، اس نے لگ بھگ ۵۰ سال حکومت کی، وہ شخصی طور پر بڑا عابد، متقی اور علم دوست بادشاہ تھا ۵ بہادر شاہ ظفر ۲۸/شعبان ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے، اپنے والد اکبر ثانی کے انتقال کے دو روز بعد ۳۰/ستمبر ۱۸۳۷ء/جمادی الثانی ۱۲۵۲ھ ہفتہ کے روز تخت نشیں ہوئے ۶ بیشتر مورخین نے بابر کی ماں کا نام قتلق نگار خانم لکھا ہے جب کہ خافی خاں نے مہر نگار خانم کے بطن سے بابر کی ولادت کو ثابت کیا ہے جو صحیح نہیں ہے ۷ قتلق نگار خانم بنت یونس خاں بن ویس خاں،

بن شیر علی خاں، بن محمد خواجہ خاں، بن خضر خواجہ خاں، بن تیمور خاں، بن ایسن بغی خاں (یسو) بن داوا چیچان (داوا خاں؟) بن بودک خاں (براق خاں-غیاث الدین؟) بن سنگر، بن کامگار، بن چنگیز (ظہیر الدین محمد بابر، ایل، ایف، رس بروک ولیمز، ترجمہ اردو ڈاکٹر رفعت بلگرامی، ص۴۱، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۹ء، تیسرا ایڈیشن) ۸ چوں کہ بابر کی تخت نشینی ۱۱/یا ۱۲/ میں ہوگئی، اس کم عمری میں بابر کی اعلا تعلیم کا امکان کم ہی رہ جاتا ہے، البتہ رسم کے مطابق ہی انہیں تعلیم دی گئی ہوگی، ان کے پہلے اتالیق شیخ فرید بیگ تھے، بابا قلی علی خدائی بیری بیگ اور خواجہ مولانا قاضی عبداللہ کے نام ملتے ہیں جن سے بابر نے تعلیم حاصل کی، ان اساتذہ کے بارے میں بابر نے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بزم تیموریہ، سید صباح الدین عبدالرحمن، ص۶-۵، مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۴۸ء، اور بابر کی خودنوشت سوانح عمری تزک بابری بہ زبان ترکی، بیورج، لندن ۱۹۷۱ء بابر نامہ موسوم تزک بابری، بمبئی ۱۳۰۸ء) ۹ منتخب اللباب، ص۵۶، ظہیر الدین بابر اور ان کا عہد، ص۴۸۳ ۱۰ بابر نامہ موسوم تزک بابری، ظہیر الدین بابر، مترجم محمد قاسم صدیقی، ص۱۱-۱۰، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۰ء، دوسرا ایڈیشن ۱۱ ایضاً ص۲۰-۱۹ ۱۲ ہمایوں نامہ، گلبدن بیگم ترجمہ اردو رشید اختر ندوی، ص۱۱-۱۰، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۶۶ء ۱۳ منتخب اللباب، ص۵۸ پر تفصیل ملاحظہ کی جائے، ظہیر الدین بابر اور ان کا عہد، حسین انور ص۴۵۱ تا ۴۵۴، غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۲ء ۱۴ ہمایوں نامہ، ص۱۹ ۱۵ دولت المغلول فی الہند، یوسف کوکن ص۴، دار حافظ للطباعۃ والنشر مدراس ۱۹۸۷ء ۱۶ سیرت سید احمد شہید، سید ابوالحسن علی ندوی، ص۸۱، ج۱، مکتبہ نشریات اسلام ناظم آباد کراچی ۱۹۸۷ء ۱۷ منتخب التواریخ فارسی، ملا عبدالقادر بدایونی، ص۲۶۹، ج۱، مطبوعہ مکتبہ اردو دایرۃ المعارف الاسلامیہ، ص۸۱۵ ج۱، پنجاب یونی ورسٹی لاہور ۱۹۶۸ء ۱۸ مغلوں کا چنگیزی خاندان جب تک کافر اور اسلام سے ناآشنا رہا، برابر ہندوستان پر مغلوں کے حملے جاری رہے، ان حملوں کو خاندان غلامان، خاندان خلجیہ اور غیاث الدین تغلق نے ہمیشہ بڑی ہمت و مستعدی کے ساتھ رد کرکے مغلوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا، اس کے بعد چنگیزی مسلمان ہوکر سلطان محمد تغلق کے حلیف بن گئے اور ہندوستان پر مسلمان ہوکر انہوں نے کوئی حملہ نہیں کیا، سلطان فیروز تغلق کے عہد حکومت میں جب ہندوستان کی اسلامی سلطنت پارہ پارہ ہونے کے قریب تھی، اسی زمانے میں مغلوں کے چنگیزی خاندان کا قصر منہدم ہوکر اس کی بنیادوں پر مغلوں کے ایک دوسرے خاندان کے ایوان سلطنت کی تعمیر کا سامان ہو رہا تھا، یہ دوسرا مغل خاندان چنگیزی خاندان کا رشتہ دار تھا جس کے بانی کا نام تیمور تھا، اس نے ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کیا،

۱۳۹۹ء/۸۰۱ھ میں اس نے دہلی کو فتح کیا، ۱۵/دن دہلی میں قیام کیا، کل ایک سال کی مدت تک ہی وہ ہندوستان میں ٹھہر سکا اور یہاں کی دولت حتی کہ فیروز تغلق کے زمانہ کا چڑیا گھر بھی اپنے ساتھ لے کر چلا گیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تزک تیموری، مطبوعہ فتح الکریم، بمبئی ۱۳۰۷ھ) آئینہ حقیقت نما، اکبر شاہ نجیب آبادی، تحقیق وتخریج عبدالرشید بستوی، ص ۶۶۸-۶۵۸، شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند ۱۹۹۷ء ۱۹ منتخب اللباب، ص ۸۱-۸۰، ج ۱ ۲۰ بابر نامہ موسوم بہ تزک بابری ص ۵، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، تاریخ ہندوستان، مولوی ذکاء اللہ ص ۸۲، خلاصۃ التواریخ، سجان رائے بھنڈاری، بہ تصحیح ظفر حسن ص ۲۸۹، مطبع جے اینڈ سنس دہلی ۱۹۱۸ء ۲۱ تزک بابری ص ۵۳، تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، مترجم عبدالحئی خواجہ، مکتبہ ملت دیوبند ۱۹۸۳ء ۲۲ فرشتہ نے لکھا ہے کہ: ہندوستان کے باشندے مغلوں کی سیاست اور حکومت سے ڈرے ہوئے تھے اس لیے وہ بابر کے ابتدائی ایام میں اطاعت گزاری کی طرف مایل نہ ہوئے بلکہ ہر کوئی اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے پوری طرح بادشاہ کی مخالفت کی فکر میں رہتا تھا، چنانچہ قاسم سنبھلی سنبھل میں، علی خاں قرملی گجرات، محمد زینون دیپاپور، تاتار خاں بن مبارک خاں گوالیار میں، حسین خاں لوحانی رابیری میں، قطب خاں اٹاوہ میں، عالم خاں کالپی میں اور نظام خاں بیانہ میں خودمختاری کا اعلان کرنے لگے، دریائے گنگا کے اس پار کے علاقے پر طاقت ور افغان امیر نصیر خاں رحانی اور معروف خاں قرملی قابض ہو گئے تھے، گو یہ امیر ابراہیم لودھی کے مطیع وفرماں بردار تھے تاہم مصلحت وقت کو دیکھتے ہوئے پانی پت کے معرکے کے بعد زینون نے بہادر خاں ولد دریا خاں لودھی کو سلطان محمد کا لقب دے کر اسے بادشاہ تسلیم کرلیا تھا (ص ۵۹۷) ۲۳ ہمایوں نامہ، ص ۲۳ ۲۴ دولت المغلول فی الہند، ص ۷، منتخب اللباب، ص ۸۶، بابر نامہ موسوم تزک بابری، ص ۹۱ ۲۵ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، ص ۲۲، ادبی دنیا ضیا محل دہلی ۱۹۹۸ء ۲۶ تزک بابری، ص ۸۹ لیکن بعض مورخین لکھتے ہیں کہ بابر کا یہ فعل صرف نمایش کے لیے تھا یعنی کہ فوج کو کسی طرح قابو میں لایا جاسکے، چنانچہ ظہیرالدین محمد بابر کا مصنف لکھتا ہے کہ: اگرچہ ترک مے نوشی کا عہد کرتے وقت بابر کے خلوص میں شبہہ کرنے کا کوئی سبب نہیں لیکن کچھ مورخوں کا کہنا ہے کہ وہ اس عہد پر تمام عمر قایم رہا ثابت نہیں کیا جاسکتا، اس نے اپنے آخری عہد میں عہد کو توڑ دیا، دیکھیے کتاب مذکور، ص ۱۸۶ اور ۲۱۶ پر نوٹ مگر اس بات کو نہ ماننے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بیان کرنے والے صرف ایک انگریز مصنف ہیں اور اس کی حمایت میں کوئی دوسری روایت نہیں ملتی، دربار ملی (فارسی) فارسی زندگی کی کہانی، مرتبین شیخ محمد اکرام - ڈاکٹر وحید قریشی، ص ۱۵۲، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء ۲۷ رود کوثر، ص ۲۲ ۲۸ دولت المغلول فی الہند، ص ۸ ۲۹ ظہیرالدین محمد بابر، ص ۱۷۷ ۳۰ ایضاً ص ۱۹۷ ۳۱ رود کوثر ص ۲۲

اقبال کا تصورِ وطن

از:- جناب انیس چشتی صاحب☆

۲۰۰۳ء کے اوایل میں جب امریکہ نے عراق پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو بشمول اقوام متحدہ، دنیا کے سارے ملکوں نے اس حملے کی مخالفت کی تھی، کہا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں کسی ایک مسئلے پر، کسی ایک ملک کے خلاف اتنی بڑی تعداد میں لوگ سڑکوں پر احتجاج کے لیے پہلے کبھی نہیں نکلے تھے، اس مسئلے میں ساری دنیا ایک طرف اور امریکی صدر بش تنہا ایک طرف رہنے کے باوجود بھی وہ کسی کی نہیں مانے اور انہوں نے عراق کو تاراج کر کے ہی دم لیا، اس سے پہلے افغانستان کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا، یہاں اس سے بحث نہیں کہ کون جیتا اور کون ہارا؟ بلکہ بحث اس سے ہے کہ سب سے زیادہ کسے نقصان پہنچا؟ بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ عراق چوں کہ تاراج ہو چکا ہے، اس لیے سب سے زیادہ نقصان اسی کو اٹھانا پڑا ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، سامراجیت کی اس ضد میں سب سے زیادہ نقصان اقوام متحدہ کا ہوا ہے جو تمام ممالک کا ایک وفاق ہے اور جس کا بنیادی مقصد عالم میں "قیام امن" ہے، اگر اس کی کوششوں کے باوجود اس وفاق کا کوئی ممبر اس کی بات نہ مانے اور امن کو غارت کردے تو اس سے بڑی ناکامی اس ادارے کی اور کیا ہوسکتی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس کے پاس طاقت ہے وہ ہر ایک کی بات کو ٹھکرا سکتا ہے اور محض قوت کے بل بوتے پر ساری دنیا میں اپنی بربریت کی دھوم مچا سکتا ہے، یہ دراصل در پردہ اور غیر محسوس طریقے پر دیگر اقوام کے سامنے ایک کھلا چیلنج ہے کہ اگر تمہیں بھی اپنی بات منوانی ہے یا من مانی کرنی ہے تو طاقت کے حصول کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے، اس فکر نے دنیا کے دوسرے ممالک کو بھی سوچنے پر مجبور کردیا ہے اور امریکہ کے ہتھیاروں کی فروخت میں اضافہ ہوا ہے۔

☆ 116, Sterling House, 1984, Convent St. Pune-411001

امریکہ نے اپنے اس حملے کا نام نہاد جواز یہ بتایا تھا کہ عراق کے پاس تباہ کن ہتھیار ہیں، اس نے امریکہ کی عمارتوں پر دہشت گردانہ حملوں کی پشت پناہی کی ہے اور یہ کہ عراقی عوام پر ظلم و جبر ہو رہا ہے، اس لیے صدام کو ہٹ جانا چاہیے، حالاں کہ سب کو معلوم ہے کہ امریکہ کا اصل مقصد عربوں کی تیل کی دولت تک پہنچنا تھا اور اس نے وہ کام کر لیا، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنے ملک کی عوام کی مسرتوں کے لیے دوسرے ملک کی عوام کو لقمۂ اجل بنایا جائے اور ان کی لاشوں پر بیٹھ پر اپنے وطن کی خوش حالی کے نقشے بنائے جائیں۔

وطنیت (Patriotism) کا یہ محدود تصور زیادہ قدیمی نہیں ہے، یونان و مصر و روما کا تصور علاقائی اور نسلی تھا، بڑھتے ہوئے سامراجی شکنجے نو آبادیاتی تصور اور نام نہاد جمہوری مزاج نے اس تصور کو تراشا ہے، حد یہ ہے کہ بعض حکومتوں نے اپنے ہی ملک کی عوام پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑنے کے لیے ایسے قانون وضع کیے ہیں، جن میں بے قصور ملزم کو اپنے آپ کو معصوم اور بے گناہ اور سچا محب وطن اور یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ میں نے اپنے وطن کی سالمیت اور مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں کیا ہے، اس کی سب سے بڑی مثال خود امریکہ کی ہے جو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے جس نے پوٹا کی طرز کا ایک قانون (Patriot Act) بنا رکھا ہے جس میں پولس اور فوج کو اختیار ہے کہ وہ محض شک و شبہہ کی بنا پر کسی کو بھی گرفتار کر سکتی ہے اور الزامات لگا سکتی ہے، صفائی پیش کرنا اور اپنے آپ کو معصوم ثابت کرنا ملزم کی ذمہ داری ہے، یہ سب اپنے وطن کی حفاظت کے نام پر کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر علامہ اقبال نے وطنیت کے اسی محدود تصور کی مخالفت کی تھی جو محکوم کے لیے ہلاکت آفریں اور ناپسندیدہ قوم کے لیے پیغام اجل ہے، وطن کی مخالفت بلکہ اس تصور کی مخالفت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(وطنیت: بانگ درا)

عراق، افغانستان اور گجرات وغیرہ کے تباہ حال انسان اسی وطن پرستانہ جارحیت کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

وطن کی سرحدیں حکمرانوں کی حرصِ کشور کشائی کے سبب گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں، وہ افراد جو کل تک کسی ایک قطعہ زمین پر بود و باش اختیار کرتے تھے، حکمرانوں کی فوج کشی کے نتیجے میں آج کسی دوسرے وطن کے دست نگر اور باج گذار قرار پاتے ہیں، ملتوں پر جب جنگوں کا دورہ پڑتا ہے تو روزانہ سرحدیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں، مغربی جرمنی کے باشندے، مشرقی جرمنی کے ادغام (Unification) کی وجہ سے اب ایک وسیع تر سلطنت کے باشندے بن جاتے ہیں، ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے آج کے پاکستان میں رہنے والے برطانوی آئین کے وفادار تھے لیکن چند گھنٹوں کے اندر ان کی وفاداریاں اسلام آباد سے جوڑ دی جاتی ہیں اور اس کا انکار کرنے والے کو وطن دشمن قرار دے کر ذلیل و خوار کیا جاتا ہے، کل کو اگر ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں تو وطن کی بنیاد پر ان کی وفاداریوں کو پھر داؤں پر لگا دیا جائے گا، اقبال جیسے بالغ نظر کو بہر حال اس شکست و ریخت کا جائزہ لینا ضروری محسوس ہوا اور اس نے خالصتاً اسلامی فکر کی بنیاد پر یہ بھی کہا کہ:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے — غارت گر کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے
ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

(وطنیت: بانگ درا)

ان اشعار سے پتا چلتا ہے کہ اسلام نے بھی وطنیت کا تصور پیش کیا ہے، اسی لیے اقبال کو "گفتار سیاست کے وطن" اور "ارشاد نبوت کے وطن" کے درمیان حدِ فاصل کھینچنی پڑی۔

دور حاضر میں مسلمانوں کو جن وطنی تصورات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان میں سے کسی بھی تصور کو اپنی زندگی میں برتتے وقت نہ تو ان کا ایمان خطرے میں پڑتا ہے اور نہ ہی اسلامی تصورات وعقاید اور Ethos پر کوئی آنچ آتی ہے، اقبال کے تصور وطن کو سمجھنے اور بہ طور خاص اس شعر

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

کا مطلب واضح کرنے کے لیے ان تصورات پر کسی قدر بحث وتفصیل ضروری ہے۔

وطن کا جذباتی تصور اسوۂ نبویؐ میں متعدد جگہ وطن کی محبت کا انتہائی جذباتی انداز میں اظہار ہوا ہے، بعثت سے پہلے حضور پاکؐ اپنے ساتھ پانی اور ستو لے کر گھر سے دور جبلِ نور میں واقع غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور ہفتوں وہاں قیام فرما کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتے، یہی وہ مقام ہے جہاں آپؐ کو حضرت جبرئیل کی زیارت نصیب ہوئی، جنہوں نے آپؐ کو مقامِ نبوت پر سرفراز کیے جانے کی بشارت دی اور سورۂ علق کی ابتدائی ۵ آیتیں وحی کی صورت میں آپؐ تک پہنچائیں، وحی، پیغمبری کی بشارت اور حضرت جبرئیل کا دیدار، یہ سب کچھ اتنی جلدی اور اچانک ہوگیا کہ آپؐ کے جسم اطہر پر لرزہ طاری ہوگیا اور آپؐ فوراً جبل نور سے اتر کر اپنے مکان تشریف لائے اور اپنی شریک حیات اور بعد میں ام المومنین کے رتبے پر فائز ہونے والی خاتون حضرت خدیجہؓ سے آپؐ نے ارشاد فرمایا" زملوني - زملوني "(مجھے اڑھاؤ - مجھے اڑھاؤ) کیوں کہ اس عجیب وغریب تجربے سے گذرنے کے بعد آپؐ کانپ رہے تھے۔

جب آپؐ کی طبیعت ذرا سنبھلی تو حضرت خدیجہؓ آپؐ کو لے کر اپنے رشتے کے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں، ان کی حیثیت اس وقت نہ صرف یہ کہ گھر کے بڑے بلکہ مکہ مکرمہ کے مذہبی اور معزز لوگوں میں تھی، جو دین موسوی اور دین عیسوی کے پابند تھے، گویا اس وقت کے دین دار

مسلمان تھے، ورقہ بن نوفل انبیا کے ادیان اور تواریخ سے واقف تھے، اہل کتاب میں سے تھے اور ایک عالم دین کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، جب انہوں نے اس مرد کامل اور صادق و امین سے تفصیلات سنیں تو فرمایا:

"والذی نفسی بیدہ انک لنبی ھذہ الامة، ولقد جاءك الناموس الاکبر الذی جاء موسی، وان قومك سیکذبونك، ویؤذونك، و یخرجونك، ویقاتلونك"۔

(صحیح بخاری)

اس کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس امت کے تم نبی ہو اور تمہارے پاس وہی ناموسِ اکبر آیا ہے جو حضرت موسیٰ کے پاس آیا تھا، تمہاری قوم تمہیں جھٹلائے گی اور تمہیں اذیت دے گی اور تمہیں نکال دے گی اور تم سے جنگ کرے گی۔

ورقہ بن نوفل کے اس بیان سے حضور پاکؐ چونک پڑے، آپؐ کو سخت تعجب ہوا کہ جو قوم مجھے صادق اور امین کہتی ہے بھلا وہ مجھے نکال دے گی؟ اس وقت حیرت واستعجاب کے عالم میں اور تو کسی بات پر نہیں البتہ نکال دیے جانے پر آپؐ نے حضرت ورقہ سے دریافت فرمایا: "او مخرجی ھم؟" (کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟)، ورقہ بن نوفل نے کہا۔

"نعم، لم یأت رجل قط بمثل ما جئت به الا اعاداہ الناس وحاربوہ، وان ادرکت ذلك الیوم، وطالت بی الحیاۃ، نصرتك نصراً قویاً"۔

(الجامع الصحیح البخاری)

جو شخص بھی (اس سے پہلے) تمہارے جیسا پیغام لے کر آیا اس سے لوگوں نے دشمنی اور جنگ کی، اگر میں وہ دن پاتا اور (میری) زندگی لمبی ہوتی (تو) میں تمہاری پوری مدد کرتا۔

گو اس حدیث میں متعدد چونکا دینے والی باتیں اور بھی ہیں لیکن سرور کائناتؐ سب سے زیادہ "ویخرجونك" (اور وہ تمہیں نکال دیں گے)، اس لیے اور بے ساختہ آپؐ کی زبان مبارک سے نکلتا ہے او مخرجی ھم؟ یعنی کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ اپنے وطن سے جدائی کی اس

اچانک اطلاع نے آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، جہاں آپ کو بیت اللہ شریف کے قرب کا شرف حاصل تھا، یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو اپنے وطن سے جذباتی لگاؤ تھا۔

اس مرحلے پر حضورؐ کا چونکنا ایک بالکل فطری عمل تھا، ابھی دین و شریعت کی تدوین نہیں ہوئی تھی، انسانیت کی فلاح اور صلاح کے لیے احکام اترنے ابھی باقی تھے، ابھی تو قرآن کریم کی صرف ابتدائی ۵ آیتیں "اقراء تا علم الانسان مالم یعلم" ہی نازل ہوئی تھیں، اس وقت تک کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ ۵ آیتیں آگے بڑھ کر پوری کائنات کو اپنے احاطے میں لے لیں گی اور ان کی تعداد چھ ہزار دو سو سینتیس[1] (6237) ہو جائے گی۔

انسان کے لیے سب سے آرام اور سکون کی جگہ اس کا گھر ہوتا ہے، ذہنی اور جسمانی آسودگی اسے جتنی اپنے گھر والوں میں نصیب ہوتی ہے اتنی کسی اور جگہ میسر نہیں آسکتی، دنیا کی آخری عبادت گاہ اگر بیت اللہ شریف ہے تو دنیا کی آخری تحفظ گاہ اپنا گھر ہے اور جس مقام پر یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں تو اس مقام کی محبت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، ہم معمولی جگہوں پر رہتے ہیں لیکن ان جگہوں سے ہم کو کتنا پیار ہوتا ہے۔

ایک عام انسان کو چاہے وہ جھونپڑے میں رہنے والی بڑھیا ہو یا کھیتوں۔کھلیانوں میں کام کرنے والے بندھوا مزدور ہوں جو وطن، حب وطن، نیشنلزم اور نیشنلٹی وغیرہ کو جانتے بھی نہیں ہیں، لیکن اپنی اس جھونپڑی سے محبت ہوتی ہے جہاں اس نے پہلی بار اپنی ماں کا چہرا دیکھا تھا اور اس گلی اور میدان سے جہاں وہ پہلی بار اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا تھا، محبت ہوتی ہے، ایک مثال سے اس کیفیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بچپن میں اگر کسی جگہ ہمارا قیام تھوڑے دنوں کے لیے بھی رہا ہے اور پھر طویل عرصے کے بعد جب دوبارہ اسی مقام پر کسی وجہ سے جانا ہوتا ہے تو اپنے میزبانوں سے فرمائشیں کر کر کے اس جگہ لے چلنے کا اصرار کرتے ہیں جہاں ہم نے بچپن کے کچھ دن بتائے تھے، رام لعل اردو کے مشہور افسانہ نویس تھے، وہ اور ان کا خاندان ۱۹۴۷ء میں ترک وطن کر کے ہندوستان آگیا تھا، کئی برسوں کے بعد کسی پروگرام میں شرکت کرنے کے لیے جب انہیں

۱؎ بعض مفسرین کے نزدیک ان آیات کی تعداد ۶۲۳۸ ہے کیوں کہ وہ بہ شمول بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی ۷ آیتیں تسلیم کرتے ہیں۔

دوبارہ لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو وہ اپنا آبائی مکان دیکھنے گئے جو اب کسی دوسرے کے قبضے میں تھا، نئے مکینوں نے ان کی بہت خاطر تواضع کی اور جب وہاں سے چلنے لگے تو انہوں نے رام لعل کو کچھ ہدیے پیش کرنا چاہا مگر مہمان نے کوئی بھی چیز لینے سے انکار کر دیا اور ایک عجیب و غریب چیز کی فرمائش کی کہ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اپنے آنگن کی تھوڑی سی مٹی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں"، چنانچہ انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے وہ مٹی بھری جس میں ان کے اپنے بچپن کی یادیں، ماں کی لوریاں اور زندگی کے سہانے سپنے پیوست تھے، اس طرح وہ اپنے وطن کی مٹی لانے میں کامیاب ہو گئے جس کے لیے دنیا کا کوئی قانون، کسی قسم کا پوٹا اور کوئی امریکی Patriot Act لاگو نہیں ہو سکتا، یہ ایک ایسا حسین جرم ہے جس میں کسٹم کے ہزاروں قوانین بار بار توڑنے کو جی چاہتا ہے اور بھی متعدد مثالیں ہیں۔

جس حادثے کی ورقہ بن نوفل نے نشان دہی کی تھی، آخر وہ واقعہ نبوت کے تیرہویں سال پیش آہی گیا، اس وقت تک ورقہ بن نوفل وفات پا چکے تھے، کفار قریش ابوجہل کی اقتدا میں ایک رات آں حضرتؐ کا کام تمام ہی کرنے والے تھے کہ اشارۂ غیبی پاکر آپؐ نے ہجرت کا تہیہ کیا اور جب مکے سے نکل کر مدینے کو روانہ ہو رہے تھے تو آپؐ نے اپنے وطن کو خطاب کر کے فرمایا:

"خدا کی قسم اگرچہ میں تجھ سے رخصت ہو رہا ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو سب شہروں میں عزیز اور محبوب شہر ہے اور اگر تیرے باشندے مجھے تجھ سے جدا نہ کرتے تو میں ہرگز تجھے نہ چھوڑتا"، ایک روایت میں ہے کہ آں حضرتؐ نے خروزہ کے مقام پر اپنی سواری کو ٹھہرایا اور بیت اللہ کی طرف دیکھ کر فرمایا: "خدا کی قسم اللہ کی زمین میں تو میرے لیے محبوب ترین جگہ ہے اور اللہ کے نزدیک بھی تو اس کی زمینوں میں محبوب ترین جگہ ہے، اگر تیرے باشندے زبردستی مجھے نکلنے پر مجبور نہ کرتے تو میں تجھے چھوڑ کر نہ جاتا"۔

ام السیر، سیرت حلبیہ میں مرتب نے سخاوی کی کتاب "جمال القراء" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "جب آں حضرتؐ مکے سے ہجرت کر کے مدینہ کو روانہ ہونے لگے تو رک کر آپؐ نے مکے پر نگاہ ڈالی اور رو پڑے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی[1]"

۱؎ سیرت حلبیہ (اردو) جلد ۳، ص ۸۴۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (محمد:۱۳)	اور بہت سی بستیوں کو جو قوت میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں جس کے رہنے والوں نے آپ کو گھر سے بے گھر کر دیا، ہم نے ہلاک کر دیا سوان کا کوئی مددگار نہ ہوا۔

ہجرت کے بعد نبی آخرالزماںؐ نے صرف چار مرتبہ مکے کا رخ کیا لیکن صرف تین مرتبہ آپؐ وہاں تشریف لے جاسکے، پہلی مرتبہ آپ کو پورے کاروانِ صحابہؓ کے ہمراہ حدیبیہ سے ہی لوٹنا پڑا کیوں کہ قریش مکہ نے آپ کو مکے میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں دی اور یہ شرط لگادی کہ آپؐ اگلے سال تشریف لائیں، صحابہ کرام کے دل میں اپنے وطن کے دیدار کی تمنا انگڑائیاں لے رہی تھیں اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھے لیکن قاید کے حکم کے آگے اپنی ہر تمنا کو قربان کرنا پڑا، اگلے سال ۷ھ میں یہ عمرہ قضا کیا گیا، آں حضرتؐ نے صرف تین دن کے لیے اپنی محبوب سرزمین پر قیام فرمایا، اسی دوران آپؐ نے حضرت میمونہؓ سے نکاح فرمایا، دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا، سارے قبیلۂ قریش کو مدعو کیا لیکن کھانے میں کوئی شریک نہیں ہوا، آپؐ اپنی پوری جمعیت کے ساتھ مدینہ منورہ لوٹ آئے۔

مکہ مکرمہ میں سب سے اہم داخلہ ۸ھ میں ہوا جب فتحِ مکہ کے موقع پر ایک فاتح کی حیثیت سے آپ اپنے وطن میں داخل ہوئے، اس وقت آپ کو اپنے وطن میں قیام کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا لیکن آپؐ نے وہاں قیام نہیں فرمایا اور ضروری انتظامات کے بعد دوبارہ مدینہ منورہ لوٹ آئے، آپؐ سلطنت کے مطالبات اور انتظام کے واجبات مکے میں قیام کرکے بھی پورے کرسکتے تھے اور کسی کو مطلق اعتراض نہ ہوتا لیکن ملت کے عظیم مفاد کی خاطر آپؐ نے لوٹنے کو ہی ترجیح دی اور کسی صورت میں بھی وطن کی محبت کو دامن گیر نہیں ہونے دیا۔

وطن سے ہجرت کرنا، فاتح کی حیثیت سے داخل ہونا اور انسانی فلاح کے ایک عظیم مقصد کی خاطر واپس لوٹ آنا، انسان کی تاریخ کا نہایت عظیم الشان واقعہ ہے، آپؐ نے مدنی ترقیات، آبادیوں کی نقل و حرکت اور اصولوں کی قربان گاہ پر اپنے جذبات کو بھینٹ چڑھا دیا، اس سے انسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے، اس واقعے سے شریعت واطاعت کے مسایل

کی گتھیاں سلجھتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعلا مقاصد کے سامنے محض جذبات کی کوئی اہمیت نہیں ہے، یہی شانِ نبوت ہے، فکر کی اسی بلندی نے پورے کرۂ ارض کو انسانوں کا صرف مسکن ہی نہیں بلکہ وطن اور ان کو بھائی بھائی بنادیا ہے، اس تفصیل کی روشنی میں وطن کے تعلق سے اقبال کے وہ سارے اشعار ملاحظہ کیجیے جو ملکوں کی سرحدوں کو ڈھاتے اور دور دراز ملکوں میں بسنے والے انسانوں کو ایک کنبہ بنا دیتے ہیں، یہی وہ نبوی شعایر ہیں جہاں سے اقبال نے اپنے وطن کی تعمیر کے لیے خام مال فراہم کیا تھا۔

بہ کثرت قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ سے ''ملت آدم'' کا ایک انوکھا تصور عالم انسانیت کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے لیکن طوالت کے خوف سے یہاں صرف ایک آیت نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے تاکہ قارئین اقبال کے تصورِ وطن کی تہ تک پہنچ سکیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳)	''اے لوگو! ہم نے تم کو (ایک جوڑے) مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں کی صورت دی، تاکہ تم پہچانے جاؤ، حقیقتاً اللہ کی نگاہ میں معزز ترین وہی ہے جو متقی (پرہیزگار) ہو، بیشک اللہ علیم اور ہر بات سے باخبر ہے۔

اب علامہ کے صرف اردو کلام سے بہ طور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ بیسویں صدی میں مغرب کی چند استعماری طاقتوں کے ذریعے پیدا کردہ ''وطن کے نام نہاد ہیولے'' کو اقبال نے کس پاتال میں پہنچایا ہے:

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب کا نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا ...... بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تفریقِ ملل ، حکمتِ افرنگ کا مقصود اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

وطن کے اس آفاقی تصور کو اگر ہجرت کے واقعے کی روشنی میں دیکھیے اور یہ تصور کیجیے کہ آں حضرتؐ اقتدارِ اعلا حاصل ہونے کے باوجود مدینہ منورہ تشریف نہیں لے جاتے اور وہیں مکے میں آباد ہو جاتے یا بہ غرضِ محال ہجرت ہی نہیں فرماتے تو کیا ہوتا؟

۱- رہتی دنیا تک یہ بات مشہور ہو جاتی کہ آپؐ نے محض مکے کے اقتدار سے سردارانِ قریش کو بے دخل کرنے کے لیے یہ تحریک چلائی تھی یا جنگیں لڑی تھیں، جب اقتدار حاصل ہو گیا تو آپؐ وہیں آباد ہو گئے۔

۲- آپؐ اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور ماننے والوں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانا چاہتے تھے، عام مظلوم انسانیت سے آپؐ کو کچھ لینا دینا نہ تھا جیسا کہ ملکوں کو آزادی دلوانے والے سورماؤں کا معاملہ رہا ہے۔

۳- آپؐ کی مقبولیت اور محبوبیت کے نتیجے میں سارے لوگ مکہ ہی میں آباد ہو جاتے اور مکے کے اصلی باشندے اقلیت میں ہو جاتے جس کے نتیجے میں مکی عربی تہذیب، ثقافت، زبان اور روایات (Ethos) کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا۔

۴- اگر بہ غرضِ محال آپؐ ہجرت ہی نہ کرتے تو دیگر مذاہب کی طرح دینِ اسلام بھی ایک مقامی اور علاقائی مذہب بن کر رہ جاتا اور چار دانگِ عالم میں اس کا ڈنکا نہ بجتا جو صحابہ مکی زندگی میں حبشہ وغیرہ ہجرت کر گئے تھے اور ان کی وجہ سے اسلام کا جو تعارف دیگر ملکوں میں ہو رہا تھا وہ بھی رک جاتا۔

۵- مکے کو اگر سیاسی مرکزیت حاصل ہو جاتی تو یہ مقام آئے دن کی جنگوں ، یلغار اور

سیاسی ریشہ دوانیوں کا مرکز بن جاتا اور کعبے کی تقدیس و حرمت کو بچانا آپ کو بھی اور آنے والی نسلوں کے لیے مشکل ہو جاتا۔

غالباً ان ہی وجوہ کی بنا پر نبی آخر الزماںؐ نے ہجرت فرمائی اور اپنے وطن سے نہایت جذباتی لگاؤ اور اقتدارِ اعلا کے حصول کے باوجود بھی مدینہ منورہ ہی میں قیام کرنے کو ضروری سمجھا، اس سے جہاں مدینے والوں کو تقویت ملی اور ان کی تقویت سے اسلام کو فائدہ پہنچا، وہاں اسلام ارضی اوطان کی قید سے آزاد ہو کر آفاقی بلکہ انسانی بن گیا، آج انسان اگر چاند اور مریخ پر بھی جائے تو اسلام اس کی ضرورت اور مسلمانوں کا وجود اس کے لیے باعث اہمیت ہے، اقبال نے جو "قومیتِ اسلام" کا لفظ کہیں کہیں استعمال کیا ہے، وہ ان کی مجبوری ہے کیوں کہ انسانیت کے اس عظیم تر مفاد کا بالکل سیکولر بنیادوں پر حل اسلام سے پہلے کسی مذہب نے پیش ہی نہیں کیا تھا، اس لیے یہاں اسلام ایک علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے، نہ کہ عقیدے اور عقیدت کے طور پر۔

وطن کا سیاسی تصور عالم انسانیت کے رابطے کی تاریخ میں شاید سب سے نامبارک دن وہ تھا جب انگلستان نے ۱۸۵۸ء میں پہلا پاسپورٹ جاری کیا،[۱] پاس پورٹ اور ویزا کے اجرا نے انسانوں کو سرحدوں کی حد بندیوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا، صرف انسان ہی نہیں بٹا بلکہ تعلیم، تہذیب، ثقافت، زبان سب کچھ بٹ کر رہ گئی، پہلے قومیت کے نام پر ملک بٹے، دیواریں اونچی ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ زبان اور تحریکوں (ازم) کے نام پر ممالک بٹتے چلے گئے، مشرقی جرمنی کو مغربی جرمنی سے صرف اس لیے الگ کر دیا گیا کہ مشرقی جرمنی (FGR=فیڈرل جرمن ریپبلک) نے کمیونزم کو اختیار کر لیا تھا، حالانکہ جرمن ایک ہی قوم تھی، عسکری اور صنعتی طاقتوں کو اکٹھا کرنے کی مہم شروع ہوگئی اور اسی کے نتیجے میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم واقع ہوئی جس میں بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا، یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور ذرا ذرا سی بات پر ممالک ایک دوسرے سے ٹوٹ کر الگ ہوتے ہیں اور دنیا کے نقشے پر نوزائیدہ ملکوں کو الگ رنگ کی سیاہی سے ظاہر کرنا پڑتا ہے، اپنے وطن کو طاقت ور بنانے کی دوڑ میں پڑوسی ملکوں کا استحصال آج بھی جاری ہے اور اس جنون میں سب سے زیادہ مشرقی اور

---

۱ اس وقت پاس پورٹ کی وہ شکل نہیں تھی جو آج ہے، وہ ایک طرح کا پروانہ راہ داری ہوا کرتا تھا جو برطانوی باشندوں کو اجازت نامے کے طور پر دیا جاتا تھا۔

بہ طور خاص ایشیائی ممالک کو نقصان اٹھانا پڑا ہے،اا کیلے یورپ میں صرف لسانی بنیادوں پر دو درجن سے زیادہ چھوٹے چھوٹے ممالک وجود میں آچکے ہیں، بعض ممالک اتنے چھوٹے ہیں کہ کسی ملک سے جب کوئی ہوائی جہاز اڑان بھرتا ہے تو فضا میں بلند ہونے سے پہلے پہلے وہ دوسرے ملک کی سرحدوں سے آگے نکل چکا ہوتا ہے، ہر ملک کی زبان الگ، معاشی نظام الگ، کرنسی الگ، قوانین الگ، یورپ والوں نے تو خیر متحد ہو کر اپنی کرنسی ایک کر لی ہے اور وہاں کے کسی بھی ملک میں اب یورو (Euro) ڈالر چلتا ہے لیکن مشرقی ملکوں کا ابھی حال برا ہے، یہ ممالک چاہتے ہوئے بھی ایک نہیں ہو سکتے کیوں کہ ہر ایک کے مفادات جدا ہیں اور وہ کبھی نہ کبھی مغربی ملک سے وابستہ ہیں۔

اقبال کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ اپنے دور میں جاری وطنیت کے تصور ہی کو سکۂ رائج الوقت کی طرح آگے بڑھاتے اور وطن کی محبت کے جذباتی تصور کو ہی فکری رنگ دیتے، جیسے ان کے کلام میں ہمالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور ترانۂ ہندی جیسی نظمیں ملتی ہیں، نیا شوالہ نامی نظم میں "خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے"، جیسے ایک مصرعے سے صرف نظر، یہ پوری نظم Co-existance اور لکم دینکم ولی دین کی عمدہ تفسیر ہے اور اسلامی پیغام اخوت کا ایک نمونہ ہے۔

وطن کے اسی محدود تصور نے کشمیر، ناگالینڈ، میزورم، تبت، شمالی جنوبی کوریا، شمالی جنوبی یمن، کیوبا اور فلسطین جیسے مسایل پیدا کر رکھے ہیں، ایک اندازے کے مطابق عالمی عدالت (World Court) میں ساڑھے تین سو سے زیادہ مقدمات محض بین الملکی سرحدی تنازعات کے متعلق (Pending) ہیں جب کہ ساری دنیا میں اتنی تعداد میں ممالک بھی نہیں ہیں، وطن کے اسی محدود سیاسی تصور نے پہلی جنگ عظیم کے بعد جمعیتِ اقوام (League of Nations) کو جنم دیا ہے، جو دیکھتے ہی دیکھتے فیل ہو گئی، کلام اقبال میں اس کی ناکامی کی پیشین گوئی دکھائی دیتی ہے، اقبال کے تصور وطن کو مزید واضح کرنے کے لیے ضرب کلیم کی سلسلہ وار تین نظمیں پیش کی جاتی ہیں جن سے قارئین کو اُس سیاسی تصور کی ناکامی اور کمزور قوموں پر حریص اور طاقت ور ملکوں کی یلغار کا اندازہ ہو سکے گا:

جمعیت اقوام

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

تقدیر تو مبرم[1] نظر آتی ہے و لیکن
پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے (ضرب کلیم)

شام و فلسطین

رندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت
پُر ہے مئے گل رنگ سے ہر شیشہ حلب[2] کا
ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا؟
مقصد ہے ملوکیتِ[3] انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج[4] کا یا شہد و رُطب[5] کا! (ضرب کلیم)

سیاسی پیشوا

امیر کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاک باز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند!
ہمیشہ مورو[6] مگس[7] پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفتِ عنکبوت[8] ان کی کمند[9]!
خوشا وہ قافلہ، جس کے امیر کی ہے متاع
تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند! (ضرب کلیم)

دور حاضر میں دنیا کے سارے بڑے اور استعماری ممالک Security کے نام پر یہ عمل روا رکھے ہوئے ہیں گویا جینے کا حق صرف انہیں کو ہے، اسی محدود وطنیت کے تصور نے بم کلچر، دہشت پسندی، ہلاکت آفرینی، یرغمالیت، سیاسی قتل، بے چینی، عدم اعتمادی، غیر یقینی صورت حال، عدم تحفظ

۱ لاعلاج جس کے نتیجے کی خبر ہو شدنی ۲ شام کا مشہور شہر ۳ بادشاہت ۴ نارنگی، سنترہ، مراد اسرائیل ۵ درخت سے توڑی ہوئی نیم پختہ کھجور جو بہت لذیذ ہوتی ہے، مراد ملک شام ۶ چیونٹی ۷ مکھی ۸ مکڑی ۹ جال (مراد کمزور عوام کو اپنے جال میں پھنسانا)

اور عدم استحکام جیسے فتنوں کو جنم دیا، معصوموں کی جانوں کے ضیاع کے نتیجے میں معصوم افراد گرفتار ہوئے جن پر اذیتوں کے پہاڑ توڑے گئے اور معاملہ آج تک حل نہ ہو سکا، کاش کہ معصومانِ یورپ وطن کے اس سیاسی تصور پر نظر ثانی کرتے، کیوں کہ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس پس منظر میں ڈاکٹر علامہ اقبال کے تصور وطن کو دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ اسلام سے قریب ہے، یعنی انسانیت سے قریب ہے، دوسرے کسی مذہب میں اتنا مفصل تصور وطن پایا ہی نہیں جاتا، دیگر امتوں نے بھی ہجرت کی ہے لیکن ان کی ہجرت عارضی اور ایک متعینہ میعاد کے لیے تھی جیسے ہی حالات سازگار ہوئے انہوں نے اپنے پیدائشی ٹھکانوں کی طرف کوچ کر دیا لیکن اس کے برعکس آں حضرتؐ نے ہجرت کے عمل کو عارضی نہیں رکھا بلکہ امت کے لیے اس کو دائمی اور مستقل بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ اسلام صرف مکے اور مدینے یا حجاز کی حد تک نہیں رہا بلکہ اقصائے عالم میں پھیل گیا، کیوں کہ صحابہ کرامؓ اور مبلغین اور داعیوں کے سامنے اپنے نبی آخر الزماںؐ کی نظیر تھی کہ جب سرکار دو عالمؐ اشاعت دین کی خاطر اپنے وطن کو خیرباد کہہ سکتے ہیں تو پھر ہماری کیا حیثیت ہے؟ چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ صحابہ کرامؓ جب حجاز مقدس سے نکلے تو انہوں نے اجنبی زمینوں، نامانوس دریاؤں اور بلند و بالا پہاڑوں تک کو روند ڈالا، نئی نئی زبانیں سیکھیں اور ان میں اسلام پیش کیا، وہیں رہ بس گئے، رشتہ داریاں قایم کیں اور وہیں موت کی آغوش میں چلے گئے، آج ان کی قبروں تک کا پتہ نہیں ہے کہ کون کہاں دفن ہوا؎

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

کتابیات

۱- سیرت النبیؐ (جلد اول) از: مولانا شبلی نعمانیؒ ۲- سیرت حلبیہ (جلد اول) مرتب: مولانا محمد اسلم قاسمی ۳- کلیات اقبال (اردو) علامہ اقبال ۴- سیرت حلبیہ (جلد دوم) مرتبہ: مولانا محمد اسلم قاسمی ۵- ایضاً (جلد سوم) ۶- نبیٔ رحمتؐ (عربی) از: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۷- زبدہ بخاری، امام بخاریؒ

*****
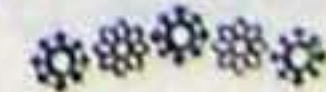
اخبار علمیہ

پاکستان کے شہر گوجرانوالہ کے جاوید اقبال کھوکھر ۹ر ٹن وزنی قرآن مجید کا ایک نسخہ تیار کرنے والے ہیں، اس کے اوراق اسٹیل کے ہوں گے، ہر صفحہ کا وزن ۷۰ر کلوگرام، لمبائی ۸ر اور چوڑائی ۴ر فٹ ہوگی جو ۳ر ٹن وزنی اسٹینڈ یا رحل پر رکھا جا سکے گا، اس کا ہر پارہ صرف چھ صفحوں پر مشتمل ہوگا، اس طرح یہ کل ۱۸۰ر صفحات کا ہوگا، اقبال کھوکھر کا بیان ہے کہ یہ قرآن مجید دو سو بیس وولٹیج کی بجلی سے چلے گا اور مکمل ڈیجیٹل اور الکٹرانک ہوگا، سننے کے لیے آڈیو اور کمپیوٹر میں سرچ کرنے کی سہولت بھی ہوگی اور کھولنے، بند کرنے کے لیے ریموٹ ہوگا، موصوف کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں اس مقدس کام میں ان کے شریک و معاون ہیں، ۱۹۹۷ء میں اس کا آغاز ہوا تھا اور ابھی ۱۶ر پارے مکمل ہوئے ہیں، شروع میں اس کے مصارف کا تخمینہ ۵ء۷ر لاکھ لگایا گیا تھا تاہم اب اس کی تکمیل میں ایک کروڑ خرچ ہونے کا اندازا ہے، کچھ نجی کمپنیوں اور مختلف شہروں میں اس کے تیار شدہ حصوں کی نمایش سے ملنے والی رقم سے اس کے اخراجات پورے کیے جا رہے ہیں، پاکستان کے زیر انتظام صوبہ پنجاب نے بھی حال ہی میں اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے ایک لاکھ روپے دیے ہیں، مکمل ہونے کے بعد مسجد نبویؐ کو بہ طور ہدیہ اس کو پیش کیا جائے گا، جاوید کھوکھر اس سے قبل دنیا کا سب سے بڑا فرشی پنکھا اور تالا چابی بنا کر گنیز بک میں اپنا نام ریکارڈ کرا چکے ہیں، اس کام میں بھی ان کا یہی جذبہ کارفرما ہے۔

جدہ کے "الاسلام" گروپ نے حضرت محمدؐ کی سوانح پر "The Bigges free-e library" قایم کی ہے، لائبریری کے ڈائریکٹر نے کہا کہ اس گروپ نے "Prophet Mohammad for all" کے نام سے نیا ویب سائٹ تیار کیا ہے جس میں انگریزی اور بعض ہندوستانی زبانوں میں رسول اللہ کی سوانح پر ۵۰ر کتابیں مہیا ہیں، خوشی کی بات ہے کہ "الاسلام انسائیکلوپیڈیا" کے عنوان سے CD کی ایک سیریز بھی تیار کی جا رہی ہے جو حضورؐ کی سوانح پر پہلی سی ڈی ہوگی، انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ ہم نے حضورؐ کی تعلیمات و ہدایات کی اشاعت و تبلیغ کے لیے جو نیا ویب سائٹ بنایا ہے توقع ہے کہ ایک سال میں ۵۰ر لاکھ افراد اس سے مستفید ہوں گے، ۱۶ر مہینے قبل "الاسلام" گروپ نے اس ویب سائٹ کا آغاز کیا تھا، اب اللہ کے فضل سے پانچ اہم اور مشہور اسلامی سائٹوں میں اس ویب سائٹ

کا نام بھی شامل ہے، اس میں ابھی مزید ۱۰۰ کتابیں داخل کی جائیں گی جن میں اکثر انگریزی زبان میں ہوں گی۔

شمس النساء کے کتابت کردہ قرآنی مخطوطات کی نمائش کا افتتاح لندن میں یونائیٹڈ کنگ ڈم اور آئر لینڈ میں سعودی عرب کے سفیر نے سعودی مرکز اطلاعات ونشریات کے زیر اہتمام کیا تھا، اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے کہا کہ خدا کا بے پایاں احسان وکرم ہے کہ شمس النساء اور ان کی جیسی دوسری ماہر فن شخصیات آج بھی موجود ہیں جو اپنی مہارت سے قرآن مجید اور رسول اللہؐ کی پر امن تعلیمات کی اصلی تصویر پیش کرتی ہیں، شمس النساء اور ان کی پوری ٹیم ہر ممکن تعاون کی مستحق ہیں۔

مریمس نٹ ویب سائٹ عورتوں کے متعلق پہلا منفرد ویب سائٹ ہے جو اسلام میں عورتوں کے حقوق واختیارات پر مفید اور قابل اعتماد معلومات فراہم کرتا ہے، اسلام سے قبل عورتوں کے حقوق پامال کیے جاتے تھے، اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے خاص طور سے عورتوں کو ان کے حقوق دیے اور انہیں تحفظ عطا کیا، مردوں کی طرح اسلامی تاریخ میں عورتوں کے بھی نمایاں کارنامے ملتے ہیں لیکن ان سے اکثر صرف نظر کیا جاتا رہا ہے جب کہ بعض مشہور مسلم خواتین کی سوانح حیات موجود ہ دور کی عورتوں کے لیے بہت سبق آموز ہیں، مریمس نٹ ویب سائٹ اسلام کے ابتدائی دور کی مشہور صحابیات اور دینی اور اسلامی مزاج رکھنے والی عصر حاضر کی خواتین کے سوانحی حالات مہیا کرتا ہے، یہ سائٹ اسلام اور عورتوں کے متعلق مضامین سے آراستہ ہے نیز اس میں ایسے اداروں کی فہرست بھی موجود ہے جن سے اس موضوع پر براہ راست استفادہ ورابطہ کیا جا سکتا ہے اور اس سے مسلم معاشرے میں عورتوں کے طرز زندگی اور ان پر اسلام کے اثرات کی تفصیل بھی جانی جا سکتی ہے۔

اسلامی ڈیولپمنٹ بینک (IDB) جدہ نے فروغ تعلیم کے لیے سو ملین سعودی ریال مختص کیے ہیں، یہ رقم سات مسلم ملکوں کے علاوہ بعض غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کی تنظیموں اور اداروں کو دی جائے گی، اس کے علاوہ ہندوستان کے صوبہ بہار میں عورتوں کے پیشہ ورانہ تربیتی مراکز کی تعمیر کے لیے ۴ لاکھ ۵۷ ہزار سعودی ریال اور بلیتن میں پیشہ ورانہ تربیتی پروجیکٹوں کے لیے ۶ کروڑ کی خطیر رقم خاص کی گئی ہے، IDB کے صدر نے کہا کہ یہ بینک پوری دنیا میں عام مسلمانوں کی ترقی وبہبود کے لیے مالی امداد بہم پہنچاتا ہے۔

حال ہی میں کویت حکومت نے کویت یونی ورسٹی میں طلبہ وطالبات کی کلاسیں الگ الگ کرنے

کا قانون منظور کیا ہے، اس قانون کے مطابق اب طلبہ وطالبات علاحدہ علاحدہ درجوں میں پڑھیں گے، ۱۹۹۶ء میں ہی کویت یونی ورسٹی میں مخلوط کلاسوں پر پابندی کی تجویز پیش کی جا چکی تھی جس کو پارلیمنٹ کے مذہبی رہنماؤں کے علاوہ عام دین دار افراد کی بھی حمایت حاصل تھی مگر اب باقاعدہ ایجوکیشن سیگریگیشن لا کے تحت پورے ملک کی یونی ورسٹیوں میں طلبہ وطالبات کی تعلیم کا الگ الگ انتظام کیا جائے گا۔

جدہ میں انٹرنیشنل فلپائن اسکول کے طلبہ کو اس کے پرنسپل کی درخواست پر الحرمین چیریٹیبل فاؤنڈیشن نے نئے قسم کے ۲۳ کمپیوٹرز کا مکمل سیٹ ہدیہ کیا ہے جو صرف طلبہ کے استعمال میں رہیں گے، فاؤنڈیشن کے ذمہ داروں نے اسلامیات کی درسی کتابیں، لیبوریٹری سائنس کے سازوسامان، دینی تقریبات کے لیے کیبن (ہال) اور متعدد شعبہ جات کے اسٹاف اور ملازمین کے لیے تعمیرات وغیرہ کا منصوبہ بنایا ہے۔

عراق کی جنگ پر مامور جنوبی کوریا کے ۳۷ فوجی افسران نے اسلام قبول کر لیا ہے، سیول کی ایک مسجد میں ان کے اسلام کا اعلان کیا گیا، جنگ بندی کے بعد عراق کی تعمیر نو کے سلسلہ میں معاہدے کے مطابق جنوبی کوریا نے ان فوجی افسروں کے علاوہ تقریباً ۶۵۰ انجینئر اور ڈاکٹر بھی وہاں ایک سال کے لیے برائے خدمت خلق روانہ کیے ہیں، سلیمان لی ہینگ اور لی امام نے بتایا کہ جنوبی کوریا کی ۴۸ لاکھ کی آبادی میں ہر پانچواں شخص مذہب اسلام سے وابستہ ہے، انہوں نے مذکورہ فوجیوں کے اسلام میں داخل ہونے کے بعد امید ظاہر کی کہ اسلام سے دلچسپی کا دائرہ مزید وسیع ہوگا جب تین ہزار فوجی جوانوں کی اکثریت عراقی مسلمانوں کے اثر سے خدا ترس اور پرہیز گار ہو کر لوٹیں گے۔

ملک وبیرون ملک آب زمزم فروخت کرنے کے ضابطوں پر سعودی حکومت نظر ثانی کر رہی ہے، رپورٹ کے مطابق اس کی ذمہ داری سرکاری کمپنی کو دی جائے گی جو اس کے منافع کی رقم سے اس مقدس آب زمزم کو صاف وشفاف اور بہتر بنانے کی کوشش کرے گی، سعودیہ کے بعض علاقوں میں آب زمزم میں دوسرا پانی ملا کر بیچنے کا عام رواج ہے مگر اب وزارت داخلہ ایسے تاجروں کے خلاف سخت کارروائی کرے گی جو سرکاری اجازت کے بغیر فروخت کر رہے ہیں، کامرس اور بلدیہ کی وزارتوں نے غیر قانونی تاجروں پر کڑی نظر رکھنے اور ان کے خلاف فی الفور سخت کارروائی کرنے کا اعلان کیا ہے جس سے غیر قانونی تاجر دہشت زدہ اور ہراساں ہو گئے ہیں۔

ک۔ص اصلاحی

وفیات

پروفیسر جگن ناتھ آزاد - ایک شریف اور باکمال انسان

۲۴؍اگست ۲۰۰۴ء کو ملک کے مایہ ناز شاعر و ادیب، مشہور محقق و نقاد، اقبالیات کے ماہر اور اس کے پایہ شناس جناب جگن ناتھ آزاد اردو دنیا کو سوگوار اور مغموم چھوڑ کر چلے گئے، وہ اردو، اردو ثقافت، ملک کی گنگا جمنی تہذیب، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، رواداری، وسیع المشربی اور بھائی چارگی کے علم بردار تھے، ان کی وفات پر کن کن چیزوں کا نوحہ و ماتم کیا جائے۔

جگن ناتھ آزاد صاحب ۱۵؍دسمبر ۱۹۱۸ء کو مغربی پنجاب (پاکستان) کے شہر عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے جو ضلع میاں والی کی ایک تحصیل تھا، ان کے والد پنڈت تلوک چند محروم پیشے کے اعتبار سے معلم تھے مگر خاندانی شرافت اور کمال کے ساتھ ایک صاحب ذوق اور بڑے قادر الکلام شاعر تھے، ان کا شمار اردو کے استاد شعرا میں ہوتا تھا، آزاد صاحب کو علم و ادب کا فطری ذوق تھا جس کو ان کے والد کی صحبت و تربیت نے بہت چمکا دیا تھا، ان کی ابتدائی تعلیم عیسیٰ خیل میں ہوئی، میاں والی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، ۱۹۳۵ء میں ڈی اے وی کالج راول پنڈی سے انٹرمیڈیٹ کیا اور ۱۹۳۷ء میں گارڈن کالج راول پنڈی سے بی اے کیا، ۱۹۴۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے فارسی میں ایم اے کیا۔

وہ شروع ہی سے صحافت سے وابستہ رہے، جب وہ انٹر کر رہے تھے تو کالج میگزین کی ادارت ان کو سپرد کی گئی، اسی زمانے سے مضامین بھی لکھنے لگے تھے، نظم گوئی کی ابتدا اس سے بھی پہلے ہو چکی تھی، ان کا پہلا مقالہ ''اقبال کی منظر نگاری'' کے عنوان سے میاں بشیر احمد کے مشہور ادبی ماہنامہ ''ہمایوں'' لاہور میں چھپا، ۱۹۴۱ء میں ماہنامہ ''ادبی دنیا'' لاہور کی مجلس ادارت میں شامل

ہوئے، ۱۹۴۶ء میں اردو روزنامہ ''جے ہند'' کے اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہوئی تو وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ دہلی میں متوطن ہو گئے، پہلے روزنامہ ملاپ کے اسسٹنٹ اڈیٹر ہوئے پھر پبلی کیشن ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا میں اسسٹنٹ اڈیٹر ہوئے، ۱۹۶۶ء میں منسٹری آف ورکس اینڈ ہاؤسنگ میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے، جنوری ۱۹۶۸ء میں پریس انفارمیشن بیورو میں ڈپٹی انفارمیشن آفیسر ہو گئے اور ۱۹۷۲ء میں انفارمیشن بیورو میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے، ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک جموں یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر اور صدر شعبہ رہے اور ۱۹۸۲ء میں پروفیسر ایمریٹس ہوئے۔

جن ہندو اہل قلم سے میرے تعلقات اور خط و کتابت رہی ان میں جناب جگن ناتھ آزاد کا نام سرفہرست ہے، اب ان کی وفات کے بعد گزشتہ پچاس برس کے واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے، بچپن ہی سے ہر قسم کے جلسوں اور مشاعروں میں شریک ہونے میں مجھے بڑا لطف ملتا تھا، اس کا فایدہ چاہے کچھ نہ ہوا ہو مگر اسی بہانے بعض بڑے خطیبوں اور شاعروں کو دیکھا اور ان کے خطبے اور کلام سنے اور بہت سے اشعار یاد ہو گئے۔

یہ دل چسپ بات ہے کہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب اترپردیش میں اردو کشی کی مہم شباب پر تھی اور پنڈت گووند ولبھ پنت اور ڈاکٹر سمپورنا نند کی حکومتوں نے اردو کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی تو اس کے باوجود یہاں اردو مشاعرے بہت دھوم سے ہوتے تھے، داخلے کے لیے ٹکٹ اور پاس ہوتے تھے مگر سامعین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اردو کے شدید مخالف اور اسے ہندو کی شیلی کہنے والے ڈاکٹر سمپورنا نند بھی ان مشاعروں میں اپنی غزلیں سناتے تھے اور آنند تخلص کرتے تھے، اسی زمانے کے اپنے گرد و نواح کے کسی مشاعرے میں شریک ہوا تو جگر مرادآبادی، روش صدیقی، انور صابری وغیرہ کے ساتھ پہلی بار جگن ناتھ آزاد کو بھی دیکھا جن کے پڑھنے کا دل کش انداز اور پرسوز آواز کی لذت اب تک محسوس ہو رہی ہے، وہ اپنا کلام سنا کر بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ ہر طرف سے لوگوں نے کہنا شروع کیا، اپنی وہ نظم سنایئے جو آپ نے پاکستان میں پڑھی تھی۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو　　میں اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

مجھے اخبار ورسایل کی ورق گردانی کا شوق بھی بچپن ہی سے تھا، جو اخبار اور رسالہ مل جاتا اسے چاہے سمجھوں یا نہ سمجھوں پڑھنے لگتا تھا اور اگر اس میں کہیں جگن ناتھ آزاد کی غزل اور نظم ہوتی تو اسے زیادہ شوق اور دل چسپی سے پڑھتا جب کچھ کچھ سخن فہمی کی استعداد پیدا ہوئی تو غالباً ۱۹۵۱ء کے آخر میں روزانہ الجمعیۃ کے ہفتہ وار اڈیشن میں جگن ناتھ آزاد کی مشہور نظم "بھارت کے مسلماں" پڑھی جس نے قلب کو گرمایا بھی اور روح کو تڑپایا بھی، یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور ہندو پاک کے اکثر اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوئی اور دونوں جگہوں کے مسلم شعرا نے جگن ناتھ کے احسان و ممنونیت کا اعتراف وتشکر بھی کیا، ملک کی تقسیم کے زخم خوردہ ایک ہندو کی اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب سے یہ واقفیت دیکھ کر اور اس کے مخلصانہ پند وموعظت اور اسلامی وایمانی جذبات سے مملو اشعار سن کر میری طرح ہر شخص محو حیرت تھا، یحیٰ اعظمی نے کہا:

سنا تھا جسے حامل قرآں کی زباں سے　　وہ درس ملا اس کو ترے سوز فغاں سے

تاریخ وسنہ یاد نہیں غالباً ۱۹۶۰ء کے آس پاس کی بات ہوگی، ایک روز میں معمولاً جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے برآمدے میں ان کے ساتھ عصر بعد چاے پی رہا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک ممبر اور اعظم گڈھ کے وکیل مسٹر رام دھن کے ساتھ جو بعد میں کانگریس کے ٹکٹ پر کئی بار پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے جناب جگن ناتھ آزاد شاہ صاحب سے ملنے آگئے، شاہ صاحب نے ان کا بڑا پرتپاک استقبال کیا اور چاے سے تواضع کی، کچھ دیر تک ادہر ادہر کی باتیں ہوئیں پھر آزاد صاحب نے شاہ صاحب سے کہا میں جناب یحیٰ اعظمی سے ملنے کا خواہش مند ہوں، چنانچہ میں انہیں لے کر یحیٰ صاحب کے گھر گیا، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اس طرح کچھ دیر ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی گولڈن جبلی میں ملک کے دیگر اکابر کی طرح وہ بھی تشریف لائے تو پھر تجدید ملاقات ہوئی، اسی موقع پر انہوں نے مشہور فاضل مالک رام صاحب سے بھی ملایا، دونوں فضلا سے مل کر جو خوشی ہوئی اسے یاد کرکے اب بھی جھوم اٹھتا ہوں۔

دسمبر ۱۹۷۴ء میں شاہ صاحب کا انتقال ہوا تو وہ تعزیت کے لیے دارالمصنفین تشریف لائے، اسی زمانے میں بھوپال سے مولانا محمد عمران خاں صاحب بھی تعزیت کے لیے دارالمصنفین تشریف لائے تھے، کھانے، ناشتے اور دوسری مجلسوں میں سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب سے ان حضرات کی جو گفتگو ہوتی اس میں میں بھی شریک رہتا اور لطف اندوز ہوتا، اس کے بعد سید صباح الدین صاحب اپنی ذاتی اور دارالمصنفین کی ضرورتوں سے پاکستان تشریف لے گئے اور کئی مہینے ان کو وہیں قیام کرنا پڑا، اسی اثنا میں آزاد صاحب کا مضمون "علامہ اقبال اور مغربی مفکرین" معارف میں اشاعت کے لیے آیا، اس کی رسید دیتے ہوئے میں نے ان کو لکھا کہ ابھی موصوف پاکستان ہی میں ہیں، آزاد صاحب نے جواب میں لکھا وہ سعی لاحاصل میں لگے ہوئے ہیں، اس کے بعد سے ان سے گاہے ماہے خط وکتابت رہتی اور وہ صباح الدین صاحب کو بھی خط لکھتے تو مجھے سلام لکھتے۔

ایک دفعہ لکھنؤ میں مقبول احمد لاری صاحب کے یہاں ملاقات ہوئی تو دارالمصنفین اور مختلف علمی وادبی مسایل پر دیر تک باتیں ہوتی رہیں، اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کا ذکر آیا تو کہنے لگے ہندوستان میں مسجدوں میں دو مینار ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے نظم کا یہ مصرع "اس کا منارۂ بلند عرش گہہ جبرئیل" میرے لیے باعث خلجان تھا کہ واحد "منارہ" کا استعمال ضرورت شعری یا کس بنا پر کیا ہے، میں اسپین گیا تو اسی خلجان کو دور کرنے کے لیے مسجد دیکھنے گیا جس کا ایک ہی منارہ تھا۔

دہلی میں بھی بعض سمیناروں میں ملتے تو بڑی محبت اور خلوص سے پیش آتے، مولانا آزاد یونی ورسٹی نے مولانا کے یوم پیدائش پر ایک پروگرام دہلی میں کیا تھا جس میں ترجمان القرآن کے حوالے سے میں نے اپنے مضمون میں مولانا آزاد کی مذہبی رواداری دکھائی تھی جس کی داد انہوں نے اور خواجہ حسن نظامی ثانی نے خاص طور پر دی تھی۔

ان سے تعلقات فزوں ہوئے تو ان کی جو کتاب چھپتی یا کوئی اور ان پر کتاب شایع کرتا تو معارف میں تبصرے کے علاوہ اس کا ایک نسخہ میرے لیے بھی بھیجتے، ایک بار حاجی ادریس دہلوی ان پر کوئی کتاب مرتب کررہے تھے تو انہوں نے اس کے لیے مجھ سے بھی مضمون کی فرمایش کی پھر آزاد صاحب کا بھی خط آیا کہ حاجی صاحب کی فرمایش پوری کریں، اب میرے لیے فرار مشکل

ہوگیا اور میں نے ''جگن ناتھ آزاد کا رنگ حرم'' کے عنوان سے مضمون لکھا، جسے آزاد صاحب نے بہت پسند کیا، اس طرح ان سے اخلاص و مودت کا رشتہ بڑھتا رہا جو اب ان کی وفات کے بعد منقطع ہوگیا ہے تو میرے لیے ان جیسے پرخلوص کی جدائی کا صدمہ ناقابل برداشت ہو رہا ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے اردو دنیا میں پہلے ایک شاعر کی حیثیت سے اپنا سکہ جمایا، انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت تھی، رباعیات، قطعات اور بچوں کے لیے بھی نظمیں کہی ہیں، نظموں کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے، قومی نظمیں اور مرثیے بھی کہے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد انداز کے ہیں، ان کی ایک طویل نظم جمہور نامہ ہے، اس میں ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا کی سرگزشت بیان کی گئی ہے، اس کا ایک حصہ جو رسول اکرمؐ کی ولادت باسعادت اور بعثت وغیرہ سے متعلق ہے، بڑا موثر اور دل کش ہے، یہ جب معارف میں چھپا تو اسلامی علوم کے فاضل یگانہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو بہت پسند آیا اور انہوں نے اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا، آزاد صاحب کامیاب غزل گو بھی ہیں مگر نظم نگار کی حیثیت سے ان کا پایہ زیادہ بلند ہے۔

جگن ناتھ آزاد اردو کے اچھے مصنف، دیدہ ور نقاد اور بلند پایہ محقق تھے، ان کی متعدد نثری تصانیف نے بھی ان کی عظمت میں چار چاند لگائے ہیں جو سوانح، خود نوشت حالات شخصی خاکوں، تنقید اور سفرناموں پر مشتمل ہیں مگر ان کا خاص موضوع اقبالیات ہے جس سے ان کو شروع ہی سے بڑا شغف تھا، اس موضوع پر انہوں نے مضامین اور تصنیفات کے انبار لگا کر اپنے کو اقبال کا سب سے بڑا عارف و مبصر ثابت کر دیا اور ان کے افکار و خیالات کی ترجمانی و اشاعت کا حق ادا کر کے ہندوستان میں ان کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کی عظمت کا لوہا بھی منوایا، اقبالیات سے متعلق ان کی متعدد نثری تصانیف ہیں جن میں اقبال اور مغربی مفکرین معرکے کی کتاب ہے، اقبال پر انگریزی میں بھی دو کتابیں لکھی ہیں، ان کی ہر دور کے علاوہ ان کے اہل خاندان کی تصویروں کا ایک البم ''مرقع اقبال'' کے نام سے شائع کیا تھا۔

جگن ناتھ آزاد کی تصانیف نظم و نثر کی تعداد تقریباً ۶۰ ہے، حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری اور

دفتری کاموں میں مشغولیت اور فرائض منصبی ادا کرنے کے باوجود انہوں نے اتنے سارے علمی کام کس طرح انجام دیے، وہ اردو کے واحد ایسے خوش قسمت ادیب و شاعر ہیں جن کی شخصیت اور فن پر ان کی زندگی ہی میں درجنوں کتابیں اور بعض رسالوں کے خاص نمبر شائع ہوئے جن میں متعدد پی - ایچ - ڈی کے مقالے بھی ہیں، ان کی متعدد کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے، ان کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی، وہ بیرونِ ملک کے مشاعروں، سمیناروں اور کانفرنسوں میں برابر جایا کرتے تھے، اردو کے شاید ہی کسی اہل قلم اور مصنف کی ایسی پذیرائی ہوئی ہو اور اسے اتنا حسن قبول ملا ہو، ان سے زیادہ اعزاز اور ایوارڈ بھی کسی اور کے حصے میں نہیں آیا ہوگا۔

غرض جگن ناتھ آزاد کے تصنیفی و تحقیقی کارناموں اور شعری و ادبی فتوحات کے حدود بہت وسیع تھے لیکن اس سے بڑھ کر ان کے اخلاق و کردار کی جہاں گیری تھی، وہ ایک نیک طینت اور شریف النفس انسان تھے اور ان کا دل اخلاق و سیرت کی عظمت و بلندی کی جلوہ گاہ تھا، ان کے دل کی دردمندی اور سیرت کی پختگی نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، ان کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا، جس میں علم و ادب کے ہر طبقے و درجے کے لوگ شامل تھے مگر ان کی مروت و شرافت اور دل نوازی نے سب کی تسخیر کر لی تھی، ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے ستائے اور مغربی پنجاب کے ایک بے خانماں ہندو ہونے کے باوجود ان کا آئینۂ قلب تعصب، تنگ نظری اور فرقہ وارانہ نفرت کی گرد و غبار سے صاف تھا، وہ زندگی بھر انسانی اخوت و محبت کی تلقین اور حق و انصاف کی آواز بلند کرتے رہے، احترام آدمیت، انسان دوستی، روشن خیالی، وسیع النظری، رواداری اور بے تعصبی کی جو روایتیں ان کو اپنے والد اور خانوادے سے وراثتاً ملی تھیں، ان کو برابر آگے بڑھاتے رہے، وہ ہمارے ملک کی مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی کلچر کے مجسم نمونہ تھے، آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو اور مسلمان خاص طور پر مظالم اور زیادتیوں کا نشانہ بنائے گئے، جگن ناتھ دونوں کو ان کا جائز حق دلانے کے لیے سرگرم رہے، اردو تحریک کے وہ ہمیشہ فعال رکن رہے اور آخر میں انجمن ترقی اردو ہند کے صدر بھی ہوئے، فرقہ وارانہ فسادات ہوں یا بابری مسجد کا انہدام سب نے ان کو رلایا اور تڑپایا، فرقہ واریت کے استیصال، ظلمت کدہ ہند کو بقعہ نور اور پرفتن دور کو پرامن بنانے کے

ہمیشہ آرزومند رہے، جامع مسجد دہلی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ممکن ہو تو اس دور کے انداز بدل دے انساں کا ذرا ذوق تگ وتاز بدل دے

مگر یہ حسرت لے کر وہ دنیا سے چلے گئے تاہم ان کی شاعری جن شریفانہ اور اسلامی جذبات پر مشتمل ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ تعصب اور تنگ نظری کے اس دور میں بھی انسانیت کا چراغ روشن ہے۔

انقلاب کی آندھی انہیں پاکستان سے ہندوستان اڑا لائی تھی مگر ان کا دل برابر پاکستان میں اٹکا رہتا تھا اور اس میں کبھی اس کی بدخواہی کا خیال نہیں آنے دیا، تاعمر وہاں کے اپنے استادوں، بزرگوں اور دوستوں کو اپنی محبت وعقیدت کے نذرانے پیش کرتے رہے، پاکستان کے شہروں، دریاؤں اور دوسرے مناظر کا ذکر ہمیشہ درد وحسرت سے کرتے تھے، وہ ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں مقبول رہے، وہاں کی تقریبات میں بڑے اصرار سے بلائے جاتے تھے، علامہ اقبال پر وہاں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کی صدارت کر کے ہندوستان کو بھی عزت وافتخار بخشا، جناب اسد ملتانی نے ان کی مشہور نظم "بھارت کے مسلماں" پر ان کے احسان کا اعتراف کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا ہے۔

جس دور میں ہر راہ سے نفرت کی اٹھے گرد جس دور میں نازاں ہوں تعصب پہ زن و مرد

جس دور میں دل مہر ومحبت سے ہوئے سرد اس دور میں موجود ہوں تجھ ایسے بھی ہم درد

حیراں ہوں دیر میں یہ رنگ ... دیکھ کے

ہمدرد مسلماں

"ض"

علی گڈھ اور سری نگر

میں

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کی کتابیں ... کے پتے

۱- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڈھ۔

۲- عبدالرحمن ندوی، غوثیہ بک شاپ، بادشاہ چوک، سری نگر، کشمیر۔

ادبیات

نذر آزاد

کافر بیدار دل پیش صنم به ز دیں دارے کہ خفت اندر حرم

اقبال

از:- جناب وارث ریاضی صاحب☆

کیفِ گدازِ عشق میں غلطاں چلا گیا درد و غمِ حیات کا درماں چلا گیا

ہندو[۱] چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا افسوس تو یہ ہے کہ اک انساں چلا گیا

اے ہند و پاک، تیری ثقافت کا پاسباں ملک عدم سے باندھ کے پیماں چلا گیا

وہ صاحبِ دل، مہرِ وفا، پیکرِ خلوص آئینہ دارِ عظمتِ انساں چلا گیا

انسانیت کا دردِ محبت لیے ہوئے وہ عظمتِ وطن کا نگہباں چلا گیا

جس کی ادائے کفر پہ اہل حرم کو ناز وہ آشنائے دردِ مسلماں چلا گیا

مومن تھا جس کا قلب وہ کافر نہیں رہا وہ محرمِ حلاوتِ ایماں چلا گیا

اقبال کے پیامِ محبت کا رازداں وہ ترجمانِ شاعر دوراں چلا گیا

جس کی بلند فکر ستاروں[۲] پہ ضو فشاں علم و ادب کا وہ مہِ تاباں چلا گیا

ہے جس کی آج بوئے[۳] رمیدہ کو جستجو[۴] وہ شاعرِ نوائے[۵] پریشاں چلا گیا

---

۱ یہ خیال پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی نظم "محسن کی راکھ" کے ایک شعر سے ماخوذ ہے۔ ۲ اشارہ ہے حضرت آزاد کے مجموعہ کلام "ستاروں سے ذروں تک" کی طرف۔ ۳ مجموعہ کلام۔ ۴ ایضاً۔ ۵ ایضاً۔

☆ کاشانہ ادب، سکھا (دیوراج)، ڈاک خانہ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار 845453۔

پہنچا ہے جس کو فیض نسیم حجاز[1] سے — وہ مدح خوان محسنِ انساں چلا گیا

"اب اس کو دیکھنے کو ہیں آنکھیں ترستیاں[2]" — جب گل ستاں سے وہ گل خنداں چلا گیا

آئینہ شعور میں وہ ناقد و ادیب — دکھلا کے جلوۂ رخ جاناں چلا گیا

زلف غزل کو جس نے سنوارا جگر کے بعد — سوے عدم وہ مست و غزل خواں چلا گیا

اردو ہے جس کے فکر کی نکہت سے مشک زیر — دنیاے رنگ و بو سے گریزاں چلا گیا

وہ[3] انجمن تھی جس کی نواؤں سے کیف بار — اس انجمن کا مرغ خوش الحاں چلا گیا

اردو زبان ، آج ترا محسن عظیم — شعر و ادب کا چھوڑ کے ایواں چلا گیا

درد فراق و سوز الم دل کو دے گیا[4] — آنکھوں کو دے کے اشک فراواں چلا گیا

لالہ اداس ، سرو حزیں ، یاسمن ملول — صحن چمن سے رنگ بہاراں چلا گیا

آزاد ترا کرب جدائی ہے بے کراں — تو کیا گیا ؟ سکونِ دل و جاں چلا گیا

وارث ، تلوک چند کا فرزند ارجمند — سب کو رلا کے اور وہ خنداں چلا گیا

آں مرد حق پرست و خرد مند و ذی وقار — رفت از جہانِ غم بہ سن دو ہزار چار ۲۰۰۴ء

---

[1] مجموعہ کلام۔ [2] اشارہ ہے ان کی یادوں کی داستان ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' کی طرف۔ [3] انجمن ترقی اردو (ہند) جس کا صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد تھے۔ [4] میں تقابل ردیفین کو جائز سمجھتا ہوں۔

....

مطبوعات جدیدہ

درس قرآن: از جناب مولانا محمد منظور نعمانی، ترتیب و تحقیق، جناب مولانا عتیق الرحمن سنبھلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد صفحات: ۶۲۸، قیمت: ۲۰۰/روپے، پتہ: الفرقان بک ڈپو، ۱۱۴/۳۱، نظیر آباد (نیا گاؤں ویسٹ) لکھنؤ نمبر ۱۸۔

مولانا محمد منظور نعمانی کو تحریر و خطابت دونوں میں خاص ملکہ ودیعت ہوا تھا، آسان، عام فہم، دل نشیں اور موثر اسلوب کی وجہ سے ان کی تحریر کی طرح خطابت بھی انفرادیت کا درجہ رکھتی تھی، لکھنؤ میں ان کے درس قرآن کی نشستیں بھی اس کی مثال ہیں، یہ سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا اور اس کے کچھ حصے قلم بند ہوکر رسالہ الفرقان کی زینت بھی بنتے رہے، زیر نظر کتاب میں اس تمام سرمایے کو سلیقے سے جمع کر دیا گیا ہے، قریب پینتیس سورتوں کے مضامین اس میں شامل ہیں، تفسیر کے عام و روایتی مواد و تفصیل کی ان میں گنجایش ہی نہیں تھی، اصل توجہ کلام الٰہی کے مدعا و منشا کی وضاحت و تبلیغ پر مرکوز رہی، خصوصاً آخرت اور مغفرت کے مضامین پر زیادہ زور دیا گیا، شرک و نفاق، جہاد و ہجرت اور اسرا و کہف، معجزات موسیٰ اور رفع عیسیٰ جیسے مقامات پر بھی تاریخی و فقہی و کلامی مباحث سے حتی الامکان گریز کیا گیا اور اصل مقصود پر ہی نظر رہی، مولانا ے مرحوم کی ہر تحریر کی طرح یہ مجموعہ بھی بہت مفید و نافع ثابت ہوگا۔

قرآن اور سائنس: مرتبین: پروفیسر عبدالعلی، ڈاکٹر ظفر الاسلام، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۳۲۰، قیمت درج نہیں، پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڈھ، مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ۔

سائنس اور قرآن کا موضوع اب علوم القرآن کی فہرست میں نیا اور انوکھا نہیں رہا، ہر ایجاد و انکشاف ان ذہنوں کو دستک ضرور دیتی ہے جن کو قرآنیات سے کسی نہ کسی درجہ مس ہے، لیکن دونوں کے قرب و مطابقت کی شرح میں افراط و تفریط کی شکایت بھی رہی ہے، مرعوبیت اور تعلّی کے اثر نے مطالعہ کے اعتدال کو بھی جا بہ جا متاثر کیا ہے، قرآن مجید کے اعجاز کو حدود میں منحصر کیا ہی نہیں جا سکتا، موضوع و مقصد کے لحاظ سے بے شبہ قرآن مجید انسانوں کے لیے کتاب ہدایت ہے

لیکن اس کا یہ پہلو بھی یقیناً دعوت فکر دیتا ہے کہ اس نے ابتدا سے علوم وفنون کی ترقی کی ترغیب دی اور یہ کہنا صحیح ہے کہ غور وفکر، مطالعہ ومشاہدہ اور تجرباتی تحقیق کے توسط سے اس نے علم کی تحصیل و ترویج پر خاص زور دیا، اس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ انسان کی سائنسی ترقی میں قرآن مجید کی اہمیت، عصری تقاضوں کی روشنی میں بھی برابر واضح کی جاتی رہے، اسی مقصد سے علی گڑھ کے شعبہ علوم اسلامیہ میں قرآن اور سائنس کے موضوع پر ایک بلند پایہ سمینار ہوا جس میں اہم تفسیروں کے جائزے کے علاوہ علم الجنین، تخلیق ازواج، ستہ ایام، پانی، حفظان صحت، طب اور ماحولیات جیسے عنوانوں کے تحت قرآنی تعلیمات کا جائزہ لیا گیا، اس سلسلے میں جناب محمد ریاض کرمانی کا کلیدی خطبہ واقعی اہم ہے جس میں سائنس اور اس کے معانی کی وضاحت کے بعد قرآنی دلایل اور منہاج کو بیان کیا گیا کہ قرآن پہلے حق کی خبر دیتا ہے اور پھر اس خبر کے حق میں کاینات سے دلایل پیش کرتا ہے، اس کے برعکس سائنس داں ہر ماورائے فطرت ذریعہ اور طریق علم کا منکر ہو کر نظریہ کاینات کو صرف نیچر میں محدود کر کے اپنی جولان گاہ صرف مادی اور محسوس دنیا کو قرار دیتا ہے، قرآن مجید میں کاینات اور اس کے کنہ کی خبر کے بعد کاینات پر نظر کرنے کی دعوت ہے، جب کہ سائنس معروضی مطالعہ کے نام پر بہ ضد ہے کہ وہ پہلے سے کوئی چیز تسلیم نہیں کرے گی، جس کا لازمی نتیجہ یقین کی جگہ تشکیک ہے، یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ مسلمانوں نے علم کا ایک محیط اور شامل تصور قبول کیا لیکن یورپی مفکرین نے سائنس کے نام پر طبیعیات اور ریاضی کے علاوہ تمام علوم کو مردود قرار دیا، اس کلیدی خطبہ کا ماحصل یہی ہے کہ خالص سائنسی نظریہ کاینات کی جگہ قرآنی نظریہ کاینات سے مطالعہ کے بعد ہی سائنس، فیضان الٰہی کی شکل اختیار کر سکتی ہے، دوسرے مقالات بھی اسی شان کے ہیں، علم الجنین کے متعلق جناب حکیم الطاف احمد اعظمی کا مقالہ حد درجہ معلومات انگیز ہے، ان کا یہ مضمون اور دوسرے مضامین اس اعتراف کی تفسیر ہیں کہ ''قرآن مجید جدید سائنس پر بازی لے گیا''، اس کتاب کے مطالعہ سے یہ امید کی جاتی ہے کہ یہ قرآن کریم سے تعلق مضبوط کرنے، تدبر وفکر کا عادی بنانے اور ایسا سائنسی ذہن پیدا کرنے میں مفید ہوگی جس کا مقصد انسانیت کی خدمت اور خالق کاینات کی مغفرت کا حصول ہو۔

تاریخ اسماعیلیہ: از پروفیسر علی محسن صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات

۱۸۴، قیمت: ۹۰ روپے، پتہ: قرطاس، پوسٹ بکس نمبر ۸۴۵۳، کراچی یونی ورسٹی، کراچی، پاکستان۔

منگولوں، خوارزم شاہوں اور اسماعیلیوں کے حالات کے مستند اور اہم ماخذ کی حیثیت سے تاریخ جہاں گشائی محتاج تعارف نہیں، علاء الدین عطا ملک جوینی کی یہ تاریخ ساتویں صدی ہجری سے آج تک مورخین و محققین میں متداول رہی، اس کا تیسرا اور آخری حصہ اسماعیلیوں کے حالات سے خاص ہے، مورخ جوینی کا تعلق بھی ان کے عہد آخر سے ہے، اس لیے شنید کے ساتھ دید کا اعتبار بھی اس تاریخ کو حاصل ہوا، ۳۷ء میں ہالینڈ سے اس کا ایک عمدہ تحقیقی اڈیشن شایع ہوا، اردو میں پہلی بار اسی اڈیشن کے حصہ سوم کا ترجمہ زیر نظر کتاب کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، جہاں گشائی کے اسلوب نگارش کے بارے میں یہ مسلم ہے کہ وہ ساتویں صدی ہجری کی اس نثر نگاری کا اعلا نمونہ ہے جو صنایع و بدایع اور عبارت آرائی سے ممتاز ہے، عطا ملک ایران کے قدیم اور ممتاز خاندان سے تعلق اور دربار میں اعلا مناصب اور صاحب دیوان کی نسبتوں سے سرفراز اور علم وفضل میں یگانہ تھا، اس کی یہ تاریخ اس کے علم وفضل اور نثر وانشا کی بہترین مثال ہے، اس کا ترجمہ آسان کام نہیں، فاضل مترجم کو اس کا احساس ہے لیکن واقعہ ہے کہ اس مشکل سے وہ آسان اور کامیاب گزرے ہیں، ترجمے کے علاوہ ان کے قلم سے جہاں گشائی اور اس کے مولف اور خود تاریخ اسماعیلیہ کے متعلق ایک مفید و مفصل مقدمہ بھی ہے، اصل کتاب گو اسماعیلیوں کی فتنہ پروری، شر انگیزی اور قتل وغارت گری کی داستان ہے لیکن اس کے ضمن میں پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے عالم اسلام کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ سیف وسنان کی خونی تصویر سے کہیں زیادہ عبرت انگیز ہے، باطنیوں اور اسماعیلیوں کے مذہب کے آغاز، ان کے عقاید اور عوام میں ان کے اثرات کی یہ تصویر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے خدا جانے کتنے سوالات قایم کر دیتی ہے، ائمہ اہل بیت سے ان فرقوں کا تعلق اور اس حوالے سے عوامی روایتوں کی کثرت، احادیث حتی کہ آیات کی من مانی تاویلات کا فروغ اسلامی قلم رو میں اس درجہ کیسے ہوا، الوہیت، نبوت اور امامت و مہدویت کے دعوے اس دور میں جس کثرت سے ہوئے شاید ہی کہیں اور اس کی مثال ملے اور یہ سب اس وقت جب صوفیہ وفقہا اپنے اپنے مسلکوں کی تبلیغ اور دوسرے مسالک کی تردید میں شب وروز منہمک تھے، یہ تاریخ تلخ وتاریک سہی

لیکن واقعہ ہے، چوں کہ یہ ایک عینی شاہد کی زبانی ہے اس لیے اس کی قطعیت اور زیادہ تلخ ہے، آخر میں خواجہ نصیر الدین طوسی کا ایک ضمیمہ بھی شامل ہے، خواجہ کو بغداد کی بربادی کا براہ راست ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے، اس لیے فاضل مترجم نے اس بیان کو "بہ طور عذر گناہ" نقل کردیا ہے، کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں جہاں گشائی کے متن پر حواشی کا اہتمام کیا گیا ہے، یہ سینکڑوں حواشی اس تاریخ بلکہ اس دور کی تاریخ کو سمجھنے میں بھی معاون ہیں اور ان کی وجہ سے اس ترجمہ کی قدر و قیمت میں بڑا اضافہ ہوا ہے، فاضل مترجم اس کتاب کے لیے اہل علم کی جانب سے شکریہ و تحسین کے بہ جا طور پر مستحق ہیں۔

لطیف نامہ: مرتب ڈاکٹر شمس بدایونی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۶۴، قیمت: ۵۰روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی اور ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، ۷۳-پھول والان، بریلی، یوپی۔

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، بریلی کے ان فرزندوں میں ہیں جنہوں نے خاموشی، گوشہ نشینی اور عزلت پسندی کے باوجود اپنے علمی و تحقیقی کاموں سے نیک نامی اور شہرت حاصل کی، معارف کے قارئین ان کی علمی و تحقیقی نگارشات سے بہ خوبی واقف ہیں، ان کی اکثر تحریریں معارف کے صفحات کو زینت بخشتی رہی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کی شخصیت اور علمی مرتبے کی جانب توجہ کم کی گئی، یہ کتاب اسی کمی کی تلافی ہے اور مختصر ہونے کے باوجود مکمل ہے اور آیندہ ادیب صاحب کی زندگی اور خدمات پر کام کرنے والوں کے لیے ایک بہترین ماخذ بھی ہوگئی ہے، خصوصاً ادیب صاحب کی تصانیف اور مقالات و مضامین کا اس میں جامع ذکر آگیا ہے، سرشار کی ناول نگاری سے تذکرہ نعت گویان بریلی تک پانچ کتابیں، ادیب صاحب کے ادبی و تحقیقی سفر کی داستان خود متعین کردیتی ہیں، لائق مرتب نے مرتبہ شناسی کا قابل قدر کام انجام دیا ہے اور اس کے لیے وہ مبارک باد کے قابل ہیں۔

اسلام کا نظریہ حیات و ممات: از جناب مولانا مظفر حسن ظفر ادیبی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۱۲۰، قیمت: درج نہیں، پتہ: جناب عمار ادیبی، محلہ پورہ رانی، مبارک پور، اعظم گڈھ۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرمؐ کی دعوت کو کلی طور پر تسلیم کرلینے میں ہی انسان کی اصل حیات کا راز مضمر ہے، اذا دعاکم لما یحییکم سے اسلام ہی مراد و مقصود ہے، یہ اگر حیات نو ہے تو

قرآن مجید کا نسخہ کیمیا حیات بخش ہے، اس مختصر لیکن موثر و مفید کتاب میں اسی کی تفصیل ہے، قرآن مجید کی قطعیت اور حدیث شریف کی حجیت کی بنیاد پر فاضل مصنف نے بڑے دل نشیں انداز میں، عقیدہ اور احکام و اخلاق کی تشریح کردی ہے کہ دراصل ربوبیت کے اقتضا و ارتقا کا دوسرا نام زندگی ہے اسی لیے اہل خبر و نظر نے اسے پیمانہ امروز و فردا سے ناپنے کی بہ جائے اس کی جاودانی، پیہم روانی اور ہر دم جوانی کا اعتراف کیا ہے، حتی کہ موت بھی کلیۃً ناپید ہونا نہیں بلکہ حیات کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہونے کا نام ہے، ادیبی صاحب کی شہرت خطابت کے حوالے سے زیادہ رہی، وہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے گویا بانیوں میں ہیں، حافظ ملت مولانا عبد العزیز اور مولانا امجد علی گھوسوی جیسے جید علما سے انہوں نے اکتساب فیض کیا، ایک خاص مسلک سے تعلق کے باوجود وہ مسلکی عصبیت سے مبرا رہے، یہ کتاب بھی اس کی شاہد ہے۔

اسلام، اسلامی عقاید، ایک بنیادی تعارف: از جناب مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۱۵۶، قیمت: ۳۵روپے، پتہ: مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی، پوسٹ بکس نمبر-۳۰، بھٹکل، کرناٹک اور مکتبہ ندویہ، دار العلوم، ندوۃ العلما، لکھنؤ۔

اسلام اور اسلامی عقاید کی حقانیت، ضرورت اور اہمیت کو نئی نسل کے سامنے عصری اسلوب اور تقاضوں کے تحت پیش کرنے کی ضرورت اس کتاب کی وجہ تالیف ہے، لائق مصنف ندوۃ العلما کے نوجوان اور ہونہار فارغ ہیں، بھٹکل کی سرزمین سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ آسان اور شستہ زبان میں اظہار خیال کی قدرت رکھتے ہیں، اس کتاب میں انہوں نے مسلم و مومن، کافر و مشرک، اسلام کا امتیاز، ایمان و توحید، فرشتے، آسمانی کتابیں اور عقیدہ آخرت اور تقدیر جیسے موضوعات پر عمدہ گفتگو کی ہے اور باتوں باتوں میں اسلام پر موجودہ اعتراضات کے جواب بھی سلیقے سے دیے ہیں، مثلاً ایک عنوان کے تحت بتایا گیا کہ اسلام میں کافروں کو قتل کرنے کا حکم تو درکنار اس کی اجازت تک نہیں دی گئی ہے۔

احسن السیر: از جناب مولانا محبوب احمد قمر الزماں الہ آبادی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۱۳۶، قیمت: ۵۰روپے، پتہ: مکتبہ دار المعارف بی/ ۶۳۹، وصی آباد، الہ آباد وغیرہ۔

آں حضورؐ کی حیات طیبہ کے چند نقوش پر مبنی یہ مختصر کتاب سیرت کے سرمایے میں اضافے کی ایک مبارک کوشش ہے، جس میں آسان اور سلیس زبان میں اختصار کے ساتھ واقعات بیان کیے گئے ہیں، آخر میں خلق نبویؐ کے متعلق حضرت شاہ وصی اللہ کے ایک رسالہ اور معجزات میں مولانا محمد ادریس اور محب الدین طبری مکی کے مشمولات بھی نقل کیے گئے ہیں۔

یہ داغ داغ کہانی : از ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، متوسط تقطیع، کاغذ مناسب، طباعت عمدہ، صفحات: ۲۱۸، قیمت: ۱۵۰/روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، فلاحی بک ڈپو، تکیہ، اعظم گڈھ وغیرہ۔

ادب و تنقید میں چند اچھی کتابوں کے مصنف کا شعر و سخن کی دنیا میں یہ پہلا نقش ہے، حالانکہ اس کے آثار عرصے سے مختلف رسائل کے شعری صفحات پر نمایاں ہوتے رہے اور وہ بھی نظم کے جدید پیکر یعنی آزاد نظم کی شکل میں، یہ مجموعہ تمام تر آزاد نظموں پر مشتمل ہے، حمد و نعت بھی اسی ہیئت میں ہے، تقریباً نوے نظموں کے واردات، زندگی کی طرح متنوع ہیں لیکن مشاہدہ و احساس کی صداقت و حرارت سب میں مشترک ہے، احساسات کو بے کم و کاست بیان کرنے کی خوبی نے ان کو کسی خاص نظریے یا مسلک کا پابند نہیں رکھا، شاعر کو بھی اس کا احساس ہے لیکن عصری طرز و فکر کے اثرات کے وہ منکر بھی نہیں، ترقی پسندی اور جدیدیت کے خانوں میں تقسیم کیے جانے کو وہ چنداں اہمیت نہیں دیتے، کتاب کا نام مجموعہ میں شامل ایک نظم کی مناسبت سے ہے اور یہ اس انتساب سے بھی ظاہر ہے جو انہوں نے اپنے والدین کے نام کیا ہے کہ:

داغ ہے زندگی/ اس دیے کی طرح/ بجھ چکا ہے جو اپنا دھواں چھوڑ کر/ روشنی کے نقوش رواں چھوڑ کر/ یہ مرا داغ دل/ ان کی یادوں سے ہے/ جا چکے ہیں جو بزم جہاں چھوڑ کر/

اس انتسابی نظم سے اور نظموں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، کتابت البتہ افسوس ناک ہے، اغلاط نامے کے باوجود بے شمار غلطیاں اور بھی ہیں، بعض الفاظ کا استعمال بھی درست نہیں معلوم ہوتا، مثلاً اللہ تعالیٰ کے لیے کرام و کریم، امرت کی جگہ امت، نقوش کو بہ معنی نقش کئی جگہ لکھا گیا جیسے نقوش غم کا ابھاروں، روشنی کا نقوش رواں، ایک نظم گوں گوں کے عنوان سے ہے، بچہ گوں گوں کرتا ہے، درست غوں غوں کرنا ہے۔

ع۔ص

☆☆☆

دار المصنفین کا سلسلہ تاریخ ہند

		Pages	Rs
۱۔ مقدمہ رقعات عالم گیر	سید نجیب اشرف ندوی	492	80/-
۲۔ بزم تیموریہ اول	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	605	150/-
۳۔ بزم تیموریہ دوم	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	266	50/-
۴۔ بزم تیموریہ سوم	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	276	56/-
۵۔ بزم صوفیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	746	140/-
۶۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	"	524	80/-
۷۔ مختصر تاریخ ہند	سید ابوظفر ندوی	194	50/-
۸۔ ہندوستان کی کہانی	عبدالسلام قدوائی ندوی	70	20/-
۹۔ تاریخ سندھ	سید ابوظفر ندوی	420	56/-
۱۰۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں اول	ضیاء الدین اصلاحی	410	75/-
۱۱۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں دوم (جدید ایڈیشن)	"	358	125/-
۱۲۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	648	80/-
۱۳۔ بزم مملوکیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	370	70/-
۱۴۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے	ادارہ	354	50/-
۱۵۔ ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن	238	75/-
۱۶۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں	ترجمہ: علی حماد عباسی	468	56/-
۱۷۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	134	30/-
۱۸۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں اول	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	252	50/-
۱۹۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں دوم	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	180	30/-
۲۰۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	ابوالحسنات ندوی	132	25/-
۲۱۔ عرب و ہند کے تعلقات	سید سلیمان ندوی	442	95/-